زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

چوں مرگ آید

علامہ اقبال کی بیماریوں اور مرض الموت کی تشخیص

خطوط، مستند حوالوں اور جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں

ڈاکٹر سید تقی عابدی

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہار سُو

جلد ۱۷ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۸ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہار سُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب کی دعائیں

چہار سُو کا زیرِ نظر شمارہ !

عالمی مالیاتی طوفان کی زد میں

روٹی' روزگار کیلئے اور جمع جتھے سے

محروم ہوتی خلقِ خدا

سے منسوب ہے!!!

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

مدیر معاون

بینا جاوید

رابطہ: 537 ٹینچ-III راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5467235 ای میل: waqars_oma@yahoo.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

بلراج کومل کا فن، اس وسیع کائنات کے سفر کی روداد ہے جس میں زندگی اور عصری احساس کی متحرک تصویریں اور وہ سب کچھ موجود ہے جو ہماری زندگی اور ہماری کائنات میں موجود ہے اور وہ سب کچھ موجود ہے جو نہیں ہے یا اگر ہے تو ناقابل بیان ہے۔ کومل کی نظمیں خود جذبات کے شاعروں کی طرح دل میں اتر جانے والا تراشیدہ لب و لہجہ رکھتی ہیں نہ ہمدردی طلب کرنے والے شاعروں کی طرح ہمیں گڑگڑاتی ہیں۔ یہ نظمیں اس عہد کے ایک ایسے فن کا وزن ہیں، جس کا فن معصومیت کی عظمت سے زندگی کرنے کے انداز اور موجودہ شور و شکستگی کی دنیا میں خواب اور امکانات کے پانیوں پر تیرتی ہوئی متحرک انسانی زندگی کے سفر کا تجربہ جاوید بناتا ہے۔

محمود ہاشمی (برمنگھم برطانیہ)

بلراج کومل نظم، نثر اور تنقید کے حوالے سے اردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ وہ مجھ سے عمر اور فن دونوں حوالوں سے بڑے ہیں۔ میں دل سے انہیں بڑا اور سچا فنکار مانتا ہوں۔ افسوس دلی کی ادبی سیاست کے باعث میں ان کی شخصیت اور فن کو اس طرح سے خراج تحسین پیش نہ کر سکا جو ان کا حق اور میرا فرض بنتا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)

بلراج کومل دھیمے لہجے میں بات کرنے والے فنکار ہیں۔ ان کے اسلوب میں خاموشی ندی جیسا بہاؤ ہے اختلاف کو شائستگی سے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ انہیں پڑھتے ہوئے بیانیہ کی سطح ہموار نظر آتی ہے لیکن ان کی تحریریں ساختہ نظریات پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت ضرور دیتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

قرطاس اعزاز

بلراج کومل

کے نام

رکن:

۱۔ممبر اردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۶-۸۷، ۱۹۹۶-۹۷، ۱۹۹۸-۹۹، ۲۰۰۶-۲۰۰۴

۲۔ممبر ایڈوائزری بورڈ اردو ساہتیہ اکادمی ۱۹۹۳-۱۹۹۷، کنوینر ایڈوائزری بورڈ

۱۹۹۸-۲۰۰۳، ۲۰۰۳-۲۰۰۷

۳۔ممبر اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۶-۲۰۰۴

ترتیب و تالیف:

۱۔نگران ساہتیہ اکادمی ترجمہ ورکشاپ ۱۹۸۶، ۱۹۸۹، ۱۹۹۰ء

۲۔ترتیب و تہذیب: کمپری ہنسیو انڈین شارٹ سٹوریز کے اردو ترجمہ کی چار جلدوں کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیے

۳۔ساہتیہ اکادمی کے انگریزی جریدے [illegible] کے پہلے دو شماروں کے اردو ادب سے متعلق حصے کی ترتیب و تہذیب کے فرائض سرانجام دیے

سیمینار:

مختلف ادبی موضوعات پر علی گڑھ یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی، دہلی اردو اکادمی، کرناٹک اردو اکادمی، ساہتیہ اکادمی، انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز، نئی دہلی، سارک فیسٹیول ۱۹۹۲ کے سیمیناروں میں پرچے پیش کیے۔

بیرونی ممالک کے سفر:

۱۔پاکستان۔ ۱۹۶۰، ۱۹۸۲ ادبی سمپوزیم
۲۔عراق۔ مربد پوئٹری فیسٹیول ۱۹۸۸
۳۔ماریشس، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ عالمی اردو ادب سیمینار ۱۹۸۹
۴۔ناروے۔ اوسلو مشاعرہ ۱۹۹۰
۵۔ڈنمارک۔ ادبی سمپوزیم ۱۹۹۰
۶۔جرمنی۔ ہاؤس آف کلچرز آف دی ورلڈ کی خصوصی اردو پروگرام ۱۹۹۱
۷۔سویڈن۔ ادبی سمپوزیم ۱۹۹۲
۸۔ڈنمارک۔ ادبی سمپوزیم ۱۹۹۲
۹۔انگلستان، لندن۔ ادبی سمپوزیم ۱۹۹۴
۱۰۔اردن۔ کلچرل ایکسچینج پروگرام ۲۰۰۲
۱۱۔امریکہ۔ سیاحت ۲۰۰۹
۱۲۔نیپال۔ سارک کلچرل کانفرنس ۲۰۰۹
۱۳۔دبئی۔ دوحہ (قطر) مشاعرہ ۲۰۰۶
۱۴۔چین۔ کلچرل ایکسچینج پروگرام ۲۰۰۴

☆

جہانگیر اشرف

اپنے جہانگیر مائل بہ پرواز ہیں
نظر آئیں نہ ایسے پر رکھتے ہیں

سخن فہم اور خود سخن ور بھی ہیں
اپنی ہر بات میں اک حشر رکھتے ہیں

دورِ حاضر پہ ان کی ہے گہری نگاہ
آج کل کیا ہے ہوا، خبر رکھتے ہیں

یہ سیماب صفت بے کل رہیں
قومی غیرت سے بھرپور جگر رکھتے ہیں

یہ شعروں میں کالم نگاری کریں
ہشت پہلو ہیں، ہر دو ہنر رکھتے ہیں

اپنی آنکھوں محبت کے سورج رکھیں
لب ہیں رخشندہ، ماتھے پہ در رکھتے ہیں

یار یاروں کے اور ماں کے پیارے بڑے
ساتھ تقدیرِ رشکِ قمر رکھتے ہیں

اور شہر کے معروف لکھاری ہیں یہ
اپنے احباب کے دل میں گھر رکھتے ہیں

زندگی سے یہ خوش، وہ ہیں ان پہ نثار
تین بچوں کا گھر میں ثمر رکھتے ہیں

ہیں بڑے تیز رو اور بڑے تیز پا
اک نشاں چھوڑیں پاؤں جدھر رکھتے ہیں

یہ اک دو کے قائل ہم بھی ان کے قائل
اپنی باتوں میں جادو اثر رکھتے ہیں

محاسن ہیں ان میں اقبال کیا کیا
وہی جانیں جو تر نظر رکھتے ہیں

محمد اقبال بھٹی (برمنگھم، برطانیہ)

سردار ھرکارہ

بلراج کومل

گوجرانوالہ کے گاؤں رام کا چتھا سے آغاز سفر کرنے کے بعد دلیپ سنگھ نے بہت سے مقامات اور ممالک کا سفر کیا۔ ہر سفر سے لوٹنے کے بعد اس نے اپنے دوستوں کو فراخدلی سے اپنا سفرنامہ سنایا اور محفل یاراں میں انتہائی لطف و انبساط کے ساتھ اپنا سفرنامہ سنایا لیکن آخری بار وہ ایسے سفر پر نکلا جہاں سے اس کا لوٹنا اور اپنا تازہ ترین سفرنامہ سنانا ممکن نہیں ہے۔

میری اور دلیپ سنگھ کی دوستی کا سنہری سفر کم و بیش پچھلے پچاس برسوں پر محیط ہے۔ میں یہ سفرنامہ سب کو سنانا چاہتا ہوں لیکن نہ میرے پاس دلیپ سنگھ کا بے ساختہ پن ہے نہ اس جیسی حس مزاح، نہ ترمیم و اضافہ اور مبالغہ کا وہ فن جو معمولی کو غیر معمولی بنا کر اسے جاذب و دلکش دلچسپیوں سے بھرپور افسانہ و مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔

دلیپ سنگھ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ہم دونوں پنجاب یونیورسٹی (مشرقی پنجاب) کی جانب سے مہاجرین کے لیے عارضی طور پر چلائے گئے دہلی کے کیمپ کالج کے طالب علم تھے، میں ایم اے (انگریزی ادبیات) کا طالب علم تھا۔ دلیپ سنگھ چونکہ عمر کے اعتبار سے مجھ سے چند برس چھوٹا تھا اس لئے ان دنوں بی اے کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہ اور دنیا ان کا اعجاز تھا کہ ہم پہلی ہی ملاقات میں دل و جان سے ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ عشق کے اس سلسلے میں دیکھتے دیکھتے ہر بنس سنگھ سوزا، بلا دستگیر بھی شامل ہو گئے۔ کرشن ادیب چونکہ میرے یار عشق میں پہلے سے موجود تھا اس لئے وہ بھی ناگزیر انداز میں اس سلسلے کا حصہ بن گیا۔ میں ان دنوں شاعری، بیکاری، داخلہ نوری اور ابتدائی میگساری کے مختلف مراحل سے گزر رہا تھا۔ لودھی روڈ کالونی کے ایک سرکاری کوارٹر کی برساتی میں رہتا تھا اور جویلہ سنگھ کے ڈھابے میں کھانا کھاتا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ ہم کافی ہاؤس میں گزارتے تھے۔ ایک دوسرے کو اور کچھ فوری طور جمع ہونے والے سامعین کو لطیفے اور چٹکلے سناتے تھے۔ کرشن ادیب ہزلوں اور لطیفوں کا کاروبار کرتا تھا۔ شام ہوتے ہی ہم دلیپ سنگھ، ہر بنس سنگھ سوزا اور میں تین سائیکل سوار کیمپ کالج (یہ شام کا کالج تھا) کی جانب روانہ ہو جاتے۔ ہمارے کالج سے لوٹنے تک کافی ہاؤس میں معروف گفتگو ہمارے یار عام طور پر کسی اگلی مہم کا منصوبہ تیار کر چکے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہمارے پہنچتے ہی ہم سب اس اگلی مہم پر روانہ ہو جاتے۔ ہماری مہمات بڑی بے ضرر قسم کی مہمات تھیں۔ یا تو ہم کسی تیسرے درجے کے سینما گھر میں کوئی چوتھے درجے کی فلم دیکھنے کے لیے نکل دیتے یا پھر ہلکی پھلکی سی میگساری سے سرشار ہونے کی کوشش کرتے یا اگر تہی داماں ہوتے تو جویلہ سنگھ کے ڈھابے کی دال فرائی اور تندوری روٹیاں کھا کر لودھی کالونی کی برساتی میں فرش سے لپٹ کر سو جاتے۔ فکر تونسوی اور مخمور جالندھری کے جالندھر سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ہم سب دوستوں کی ملاقاتوں کی سرشاری اور تواتر میں مزید سرگرمی پیدا ہو گئی اور یہ سلسلہ برسوں جاری و ساری رہا اور ہماری غیر محفوظ جگہوں پر منعقد ہونے والی محفلوں میں کبھی کبھی نریش کمار شاد، عدم اور کرشن موہن جیسے معتبر شاعر بھی شامل ہوتے رہے۔

دلیپ سنگھ چاہے رام کا چتھا میں تھا، یا دہلی میں ہر شے ہر شخص، ہر واقعہ کو اس کے زندگی حسن کے تناظر میں دیکھتا تھا۔ ہر شے ہر شخص، ہر واقعہ کو اعجاز لمس سے زندہ تابندہ کر دیتا تھا دوستوں کو تخت سے تخت بات اس انداز سے کہتا تھا کہ وہ بے اختیارانہ انداز میں کبھی مسکرانے لگتے، کبھی قہقہہ لگانے لگتے، کبھی دلیپ سنگھ سے رشک کرنے لگتے۔ گھر، دفتر، دوا گزر، کافی ہاؤس، شراب خانہ، ڈھابہ ہر جگہ دلیپ سنگھ کے لیے تجربات کا خزانہ موجود تھا۔ گھر میں ماں باپ، بھائی، بہن اپنی مخصوص شخصیتوں کے طفیل مخصوص اور منفرد رویوں، عادتوں اور باتوں کا خزانہ لئے ہوئے تھے، دفتر میں آفس سپرنٹنڈنٹ ہری سنگھ تھا جو ہنسو گر فر دلیپ سنگھ کو دن میں دو تین بار ڈاک ٹیشن دینے کے لیے بلاتا اور ابتدائی جملہ ہمیشہ فرانس لو یو ولیم نمبر آن دی تبلیک بعنوان ہے۔ with reference to your letter no - dated on the subject mentional above لکھوانے اور چار پانچ منٹ بے بسی کے عالم میں کمرے کی دیواروں اور چھت کا سرکاری معائنہ کرنے کے بعد یہ کہہ کر اسے رخصت کر دیتا کہ دلیپ سنگھ اپنے تجربے کی روشنی میں خود ہی چٹھی ٹائپ کر لائے۔ یہ وہی ہری سنگھ تھا جو اسے دہلی سے بمبئی جانے کی آدھے مہینے کی چھٹی تو دے دیتا تھا لیکن سنٹرل سیکریٹریٹ سے تھوڑی دور واقع گول ڈاک خانہ تک جانے کی ایک گھنٹے کے لیے اجازت نہیں دیتا تھا۔ پارک میں اسے کتے والی وہ خوبصورت عورت مل جاتی جو کتے سے خوف زدہ دلیپ سنگھ کو یقین دلاتی کر کتا کاٹے گا نہیں۔ دلیپ سنگھ بڑی خوش اخلاقی سے خاتون کی یقین دہانی کا شکریہ ادا کرتا لیکن یہ کہہ کر وہاں سے جلدی سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ "مجھے اپنی ٹانگ سے زیادہ اپنے واحد پاجامے کی زیادہ تشویش ہے۔ کالج میں جب کوئی طالب علم اسے آکر یہ خوش خبری سناتا کہ اس نے تو اچھے نمبروں سے ایم اے کا امتحان پاس کر لیا ہے اور ساتھ ہی جب استفسار کے طور پر یہ اضافہ بھی کرتا کیا وجہ ہے کہ دلیپ سنگھ کیوں اب تک امتحان کلیر CLEAR نہیں کر سکا تو دلیپ سنگھ اس کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیتا۔ "گردھاری لال تم نے اچھا کیا جو وقت پر ایم اے پاس کر لیا۔ تمہارے لیے یہی مناسب تھا میرا معاملہ تم سے قطعی طور پر مختلف ہے میرا ایم اے کی ڈگری سے ہی سب کام چل رہا ہے۔" پہاڑ گنج کے سینما گھر میں جب پردہ سیمیں پر چلتی ہوئی فلم پر اس کی رننگ کمنٹری RUNNING COMMENTARY سامعین اور ناظرین کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی

اور سینما گھر کا کوئی ملازم یا پولیس والا یا ہال میں بیٹھا ہوا کوئی شخص اسے ٹوکنے کے لیے آتا تو دلیپ سنگھ خوش اسلوبی سے اسے یہ کہہ کر رخصت کر دیتا۔

"ہم RUNNING COMMENTARY رننگ کمنٹری کے مقصد سے ہی پہاڑ گنج کے سینما گھر میں آتے ہیں اگر ہمیں خاموش بیٹھ کر فلم دیکھنا ہوتا تو ہم کناٹ پلیس کے سینما گھر اوڈین یا پلازہ میں جاتے" اس جملے کی تخلیق میں انتہائی تخلیقیت کے تناظر میں پرنس سنگھ بھولا کا اور میرا بھی حصہ ہوتا۔

میری اور دلیپ سنگھ کی پہلی ملاقات اردو زبان اور اردو ادب سے دلچسپی کے طفیل پروان چڑھی تھی اور دائمی دوستی میں داخل ہو گئی تھی۔ دلیپ سنگھ اردو، فارسی، پنجابی اور انگریزی کا پروسیع مطالعہ رکھتا تھا۔ وہ شعر اور نثر دونوں میں تخلیقی اظہار کا امکاناً آرزومند تھا۔ لیکن اس کا انکیوبیشن پیریڈ INCUBATION PERIOD ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا۔ لیکن جب وہ اپنے متنوع، بہر جہت تجربات کی بھاری بھرکم، بیش قیمت گٹھری اپنی پیٹھ پر اٹھا کر عملی تخلیقی سفر کی راہ پر نکل پڑا تو اس نے پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے ذہن اور قدموں میں بجلیاں بھر گئیں۔ وہ قلم برداشتہ ایک سیل اظہار بن گیا۔ اس کے مزاحیہ مضامین ہندوستان اور پاکستان کے تمام معتبر رسائل کی زینت بن گئے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن کے ڈرامے اور سیریل لاکھوں کروڑوں سامعین اور ناظرین کی داد و تحسین سے سرفراز ہو گئے۔ اس کی مدیرانہ قابلیت اور عملی کارکردگی نے وزارت خارجہ کے ایک "بے رنگ" سرکاری پبلسٹی جریدے کو نہ صرف رنگ و تصویر کا مرقع بنا دیا بلکہ مختلف زبانوں میں اس کی اشاعت کے ذریعے دائرہ قارئین کو بین الملکی، عالمی نوعیت سے سرفراز کر دیا۔

دلیپ سنگھ گونا گوں مصروفیات کے باوجود غیر مصروف آدمی تھا۔ سراپا ظریفی، برجستہ، شگفتہ، بے اختیارانہ سرشاری سے متصف۔ حالاں کہ وہ تخلیقی طور پر پچھلے پچاس برسوں کا "کام" چند ہی برسوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس ناگزیر عجلت کے باوجود نہ تو گفتار کے اس غازی نے اپنی باتوں کی قدر و منزلت اور دلچسپی میں کمی آنے دی، نہ کسی دوست یا ملاقاتی کو مخل کار سمجھا، نہ یاروں کی ان محفلوں سے فاصلہ پیدا کیا جو ان تھک تواتر کے ساتھ شام کی سرشاریوں سے متصف تھیں۔ دلیپ سنگھ زوال عمر کی زد میں کبھی نہیں آیا۔ جب وہ دل کے عارضہ میں غیر متوقع طور پر مبتلا ہوا تو بھی کسی ناآسودہ احساس محرومی کا شکار نہیں ہوا۔ پہلے ہی طبی ہدایات کے مطابق جامِ مے اس کے لیے ممنوعات میں شامل ہو گیا لیکن نہ تو وہ محفلوں سے کنارہ کش ہوا نہ ہی اس نے اپنی شگفتگی اور بے ساختگی کو مضمحل ہونے دیا۔ حق بات تو یہ ہے اس نے اپنے تخلیقی اظہار کی رفتار کو مزید تیز تر کر دیا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا وہ کسی بے ساختہ سرشاری کے لمحے میں طبی ہدایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حلقہ جام میں بھی شامل ہو گیا۔

دلیپ سنگھ کی تخلیقی ہمہ جہتی اور قوت کا سرچشمہ اس کا زمین سے گہرا رشتہ تھا اور وہ وسیع انسانی ہمدردی تھی جو صرف چند خوش قسمت لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس کے مزاحیہ مضامین، ڈرامے، افسانے، ریڈیائی ٹی وی سیریل سب زندہ کرداروں، عام زندگی کے معمولی سے لے کر غیر معمولی ڈرامائی صورتوں سے آباد تھے۔ اس کے کردار چاہے وہ رام کے چھتا کے ہوں یا دلی کی گلیوں کے یا کافی ہاؤس یا شراب خانے کے، سب فرقوں اور ذہنیتوں سے بھرپور ہمارے جانے پہچانے کردار تھے۔ دلیپ سنگھ نے اردو زبان کی مزاح نگاری کو محض بیگمات، بیویوں، جابر والدین، ادھر اُدھر کی سوجھنے والے پڑوسیوں، سرکاری اور غیر سرکاری رشوت خوروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے خاکوں اور مزاحیہ مضامین کی حدود سے نکال کر اسے مارک ٹوین کی طرح افسانے کا دولت اور وقار عطا کر دیا۔ "تورودین کی لاش" اور "سردار ہرکارہ" اعلیٰ افسانہ نگاری کی ناقابل فراموش مثالیں ہیں۔ یہ دونوں افسانے زندگی کی دو مختلف جہتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ "تورودین کی لاش" زندگی، موت اور لاش کی خود غرضانہ کیفی "اقتصادیات" اور عصری سماجی عامیانہ پن کی تصویر ہے۔ "سردار ہرکارہ" اس کے برعکس اس انسانی ہمدردی اور انسانی جذباتی توانائی کی طرف اشارہ ہے جو کسی ایلو گیوڑ نسل سے ملتا ہے جس کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ ہے انسان کی انسان کے ساتھ قربت، ہم آہنگی، ایک دوسرے کا دکھ سمجھنے کی شخصی وسیع القلبی۔ "سردار ہرکارہ" بطور کردار اگرچہ ایک مٹتی ہوئی نسل کی آخری مخلوق ہے لیکن اپنے انہدام میں ایک اعلیٰ و ارفع قدر کی تجسیم ہے۔ اس لحاظ سے غالباً دلیپ سنگھ بھی سردار ہرکارہ کا ہم زاد تھا۔

دلیپ سنگھ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں صرف اردو زبان اور اردو زبان و ادب کی اصناف تک محدود نہیں رہا۔ اس کی تحریریں پنجابی، ہندی اور انگریزی تراجم کے ذریعے نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ دیگر ممالک کے وسیع حلقہ قارئین تک پہنچیں اور غیر معمولی طور پر پسند کی گئیں۔ دلیپ سنگھ کی زرخیز ذہنی کا یہ عالم تھا کہ ہر لحظہ اسے کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی رہتی تھی۔ ہر لحظہ وہ کسی نئے منصوبے کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ افسانے کا یا مضمون کا عنوان ہو یا پھر کتاب کا عنوان۔ آخری فیصلہ کرنے سے پہلے وہ دوستوں کی رائے حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور ان کے مشوروں کو بڑی فراخ دلی سے قبول کرتا تھا۔ اس کی معاملہ فہمی اور حاضر دماغی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی نہ صرف کوئی نہ کوئی راہ نجات ڈھونڈ نکالتا تھا بلکہ اس تلاش میں بھی مزاح کا کوئی نادر پہلو پیدا کر دیتا تھا۔

ہم دونوں اردو زبان و ادب کے اہم تخلیق کاروں اور ان کے شاہکار کارناموں کے عاشق تھے۔ سعادت حسن منٹو ان میں سے ایک تھا۔ منٹو کی دیگر تحریروں کے علاوہ ہمیں اس کے وہ شخصی خاکے بے حد پسند تھے جو "گنجے فرشتے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ چند برس پہلے ایک

ملاقات کے دوران میں نے دلیپ سنگھ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ کچھ ہم عصر فرشتوں کا سر منٹو کے انداز میں موڑ دیا جائے اور کچھ نئے گنجے فرشتوں کی صورت میں منٹو کے گنجے فرشتوں کے سلسلے کی توسیع کر دی جائے۔ ہم لوگ عام طور پر بات کو ہضم نہیں کر سکتے تھے۔ کہیں نہ کہیں یہ بات میرے یا دلیپ سنگھ کے حسب سے نکل گئی۔ اور خبر کی صورت میں دہلی کے حلقۂ احباب میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دہشت کا یہ عالم تھا کہ لوگ یا تو تشویش میں مبتلا ہو گئے یا مزید تفصیلات کی ٹوہ لگانے لگے یا خود حفاظتی تدابیر کرنے لگے یا مجھے اور دلیپ سنگھ کو اس منصوبے سے باز رہنے کی تنبیہ کرنے لگے۔ ہمارا منصوبہ عمل پیدائش سے پہلے ہی زیر زمین چلا گیا۔ ایک روز میں نے دلیپ سنگھ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ کیوں نہ ہم ایک دوسرے کا سر موڑ دیں اور ایک دوسرے کو گنجا فرشتہ بنا کر رکھ دیں۔ دلیپ سنگھ نے چند لمحے بڑے غور سے میری جانب دیکھا اور پھر مسکرا کر یوں گویا ہوا ”یار بلراج تم عجیب آدمی ہو ایک تو میں ویسے ہی کم وبیش گنجا ہوں مگر چوں کہ میں سکھ ہوں اس لئے موڑنا تو دور کی بات ہے تم میرے چند بچے کچھے بالوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ البتہ میں تمہارا سر فوراً موڑ سکتا ہوں۔ ویسے تمہارے سر پر بھی گنتی کے چار بال باقی رہ گئے ہیں۔“ اس کے بعد دلیپ سنگھ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”بلراج میری اور تمہاری صورت حال کا فرق یہ ہے کہ تم پہلے ہی میرے بالوں تک نہ پہنچ پاؤ گے یہ بات بہرحال یقینی ہے کہ تم اپنے خاکے میں مجھے وقتاً ”گنجا“ کر کے رکھو گے اس کے برعکس میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے سر پر چمکتے ہوئے بالوں کی فصل اگا دوں گا یہ امکان میرے لیے چونکہ خطرناک ہے اس لیے بہتر ہے ہم اپنے بڑے منصوبے کا یہ ضمنی منصوبہ بھی ترک کر دیں۔“ لہٰذا یہ منصوبہ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن دلیپ سنگھ کی حس مزاح اور عالی ظرفی کے اظہار پر ختم ہوا۔

ہم سب سائیکل کے عہد سے گزر رہے تھے۔ میں دلیپ سنگھ اور ہربنس سنگھ بھولا۔ ہربنس سنگھ بھولا امریکہ میں یونیورسٹی کا پروفیسر بن کر کار کے دور میں داخل ہو گیا۔ دلیپ سنگھ وزارت خارجہ کی بیرون ملک آخری ایام میں اپنی تعیناتی کی مقررہ میعاد پوری کر کے جب انڈیا لوٹا تو کار اپنے ساتھ امپورٹ کر کے لایا اور کار کے دور میں داخل ہو گیا۔ لیکن بیرون ملک جانے سے پہلے دلیپ سنگھ دو پہیہ اسکوٹر پر دہلی کے فاصلے طے کیا کرتا تھا۔ لکی ہی ایک سیاحت کے دوران ایک روز وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آ گیا۔ بھابی صاحبہ پرہند کو دیکھی اسکوٹر کی پچھلی سیٹ یعنی پلین پر جلوہ افروز تھیں۔ جب وہ سیٹ پر سے اتریں تو میں ان کے خیر مقدم کے لیے گھر کے باہر پہلے سے موجود تھا۔ سخت گرمی کے موسم میں انھوں نے اپنے بالوں کو اسکارف میں سمیٹ رکھا تھا۔ اسکوٹر سے اترتے ہی انھوں نے گرمی کی شکایت کی۔ میں نے کہا: ”بھابی اس سخت گرمی میں آپ اپنی زلفوں کو اس عذاب میں کیوں جکڑتی ہیں۔ آپ خوبصورت ہیں اور خوبصورت عورت کی خوبصورت زلفیں اس کے خوبصورت بال ہواؤں میں اڑتے، ہواؤں میں لہراتے اچھے لگتے ہیں۔“ بھابی مسکرائیں ”تعریف کے لیے شکریہ آپ نے صحیح کہا خوبصورت عورت کے خوبصورت بال ہواؤں میں لہراتے اڑتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن میں اپنے بالوں کو اس لئے اسکارف میں سمیٹ کر رکھتی ہوں تاکہ اڑنے کے عمل میں یہ بالکل ہی نہ اڑ جائیں۔ جیسے آپ کے دوست دلیپ سنگھ کے اڑ چکے ہیں۔“ دلیپ سنگھ کے ہاتھ بے ساختہ یہ یقین کرنے کے لیے اپنے سر کی جانب اٹھ گئے کہ اس کی پگڑی اس کے سر پر قائم و برقرار ہے یا نہیں۔ پگڑی قائم و برقرار تھی۔ اور وہ گنجا پن بھی جو پگڑی کے نیچے بحفاظت چھپا ہوا تھا اور جس سے میں اور بھابی صاحبہ دونوں واقف تھے۔ ہم تینوں نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور سرشار ہو گئے۔

لام بیکاری کے دوران میں نے ایک بار دلیپ سنگھ کے سامنے ایک تجویز رکھی تھی ”دلیپ سنگھ تم سکھ ہونے کے ناطے ایک ماڈل ولیج سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہارا قد صرف پانچ فٹ دو انچ ہونے کے باوجود فوج میں بھرتی کی کم سے کم ضرورت کے مطابق ہے لہٰذا تم بیکاری کا قصہ ختم کرو فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔“

دلیپ سنگھ مسکرایا اور سر سے پاؤں تک میرے وجود اور قد کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ”ہم دونوں کم وبیش ایک جیسے قد کے ہیں۔ تم بھی فوج میں بھرتی ہو سکتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کوئی ہو کو دیکر اس یا تاج حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ میں سردیوں کی سنہری دھوپ میں گھر کے کھلے آنگن میں کمبل اوڑھ کر سونے اور خواب دیکھنے والا آدمی ہوں۔ میں فوجی فتوحات کی کوئی میزان تیار کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ میرا فوج میں کیا کام۔ میں تو پیدائشی سویلین CIVILIAN ہوں۔“ ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔ اور سردیوں کی سنہری دھوپ کو اپنے جسم و جاں میں دیر تک جذب کرتے رہے۔

دلیپ سنگھ جب تک زندہ رہا خوبصورت چہروں، ذہین محنت مند عورتوں اور شہرت یافتہ مردوں سے اپنی وابستگیوں کی داستانیں سناتا رہا۔ باتوں کے خوش رنگ، شگفتہ، رنگ برنگ پھول کھلاتا رہا۔ سنگل گفتار میں زندگی کی کروٹ سے نبرد آزما ہوتا رہا۔ پہلے ہی وہ فوجی انداز کی ذاتی فتوحات کی کوئی میزان تیار نہیں کر سکا لیکن آج وہ، جس بھی سفر میں ہے وہ سفر کی جس بھی منزل پر ہے اس کے سر پر تازگی، شگفتگی، برجستگی، بے ساختگی، ہمدردی اور جذباتی تمازت کا وہ تاج فروزاں ہے جو چھوٹی چھوٹی شخصی کیفیتوں کے باوجود فوجی فتوحات کے بجائے سنہری دھوپ، نیلگوں آسمان اور بے رحمت فنائی قربتوں اور وابستگیوں سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

میں دلیپ سنگھ کے ساتھ کم وبیش پچاس برس دوستی کے سفر میں رہا۔ یادوں کے مرغزاروں میں میرا یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

براہِ راست

چہارسو کی ابتداء سے آج تک ہم نے اداریے کے عنوان سے اظہارِ خیال کو اس لیے غیر ضروری جانا کہ بسا اوقات طبیعت آمادہ اور موضوع دستیاب نہ ہونے کی صورت میں قاری کو بے جا ثقاہت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مگر صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے تعارف اور خدمات کی بابت آپ کو باخبر کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔

جناب **بلراج کومل** کا اردو زبان و ادب سے چھ دہائیوں پر محیط عشق مجنوں کی حدیں پار کر چکا ہے۔ یہ عشق وحشتوں کی طرح کے ہیجان اور جذباتیت کا پرچارک ہرگز نہیں بلکہ خاص طرح کے ٹھہراؤ، نظم و ضبط، شائستگی اور تہذیب کا امانت دار ہے۔ جس سے آج کا قاری بہت حد تک اجنبی اور نامانوس ہے!!

اگر ہماری رائے میں سچ کا ذرا سا بھی شائبہ نظر آئے تو ہم آپ کی جانب سے ادبی ورثے کی اس اہم امانت دار کو چہارسو کے اوراق میں مقید کرنے پر داد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ وگرنہ جو مزاجِ یار میں آئے!!!

گلزار جاوید

☆ کومل صاحب! یہ تو ہم جانتے ہیں کہ آج سے اتنی برس قبل آپ کا جنم سیالکوٹ میں ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے بچپن اور نوعمری کی یادوں کو آواز دے کر کچھ دیر کے لیے مٹھی میں مقید کر لیا جائے؟

☆☆ میرا جنم ضلع سیالکوٹ کے گاؤں نکودر میں ہوا جہاں میرے دادا دادی رہتے تھے۔ میرا بچپن اور بی۔اے تک تعلیم کے دن فیروز پور میں گزرے جہاں میرے والد محترم، میری ماں اور میرے دو بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ہمارا خاندان مقیم تھا۔ میرے والد نے مرے کالج سیالکوٹ سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے درس و تدریس کو اپنا کیریئر بنانے کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اور مختلف تعلیمی اداروں کی ملازمت سے گزرنے کے بعد بالآخر فیروز پور کے ایک ہائی سکول سے وابستہ ہوئے جہاں سے وہ بطور ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۵۵ء میں دہلی منتقل ہوئے جہاں میں بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں پہنچ چکا تھا اور دو سال کے عرصے میں ایم۔اے کا امتحان پاس کر چکا تھا۔ بی۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے عرصے میں مجھ پر اتفاقاً یہ انکشاف ہوا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ ان دنوں اسکولوں میں آٹھویں درجے تک ذریعہ تعلیم اردو زبان تھی لہٰذا بی۔اے کے دو برسوں میں لاہور کے کئی ادبی رسائل کی ورق گردانی اور مطالعے کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں شاعر ہوں اور میں دونوں یعنی نظم و نثر میں تخلیقی اظہار کرنے لگا۔ ۱۹۴۸ء میں میں نے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی برس "سنگ میل" لاہور میں میری پہلی نظم بعنوان "اکیلی" شائع ہوئی۔ اس نظم کو فوری شہرت نصیب ہوئی اور ۱۹۴۸ء کے منتخب نظموں کے کم و بیش ہر مجموعے میں اس نظم کو جگہ ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ ہمارا تعلیمی ماحول عام طور پر طلباء میں تخلیقی امکانات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ والدین اور اساتذہ تخلیقی امکان کو "بے راہ روی" کی علامت سمجھتے ہیں اور بچوں کو اس کی سزا بھی دیتے ہیں۔ شعر گوئی کی منزل میرے تعلق سے چونکہ کالج کے دنوں میں میرے حصے میں آئی لہٰذا اس سزا سے تو محفوظ رہا لیکن طنز و تضحیک کا ہدف بہرحال بنا رہا۔ ہم جماعت دوستوں اور اساتذہ کا ردعمل ہمدردانہ تھا لیکن مکمل طور پر حوصلہ افزا بھی نہیں تھا۔

☆ اٹھارہ برس کی عمر میں جب فیروز پور سے لاہور اشاعت کی غرض سے آئے تو اس سے قبل کہاں کہاں آپ کا کلام شائع ہوا؟

☆☆ میں اشاعت کی غرض سے فیروز پور سے لاہور کبھی نہیں آیا البتہ یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ میں شاعر ہوں میں کتابیں اور رسائل جمع کرنے کے مقصد سے کالج سے فرار ہو کر لاہور ضرور جاتا رہا۔ پہلی نظم "اکیلی" کی اشاعت کے بعد میرا کلام ادب لطیف اور ہندوستان و پاکستان کے کئی ادبی رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی نے میرا پہلا مجموعہ "میری نظمیں" شائع کیا جو عام طور پر پسند کیا گیا۔

☆ آپ کے نام سے ذہن میں فوری تاثر ہندی کوی یا لیکھک کا ابھرتا ہے۔ ہندی زبان و ادب سے آپ کا شغف اور شناسائی کس طرح کی ہے؟

☆☆ جی ہاں میرے نام کی نسبت سے کچھ ایسا ہی تاثر ابھرتا ہے لیکن میں اپنے بنیادی مزاج کا اسیر ہوں اور یہ بنیادی مزاج اردو زبان و ادب کا اسیر ہے۔ ہندی زبان و ادب کی میری واقفیت میرے نزدیک واجبی سی ہے۔ البتہ ہندی رسم الخط میں بخوبی لکھ پڑھ سکتا ہوں۔

☆ آپ کی مادری زبان پنجابی ہوتے ہوئے بھی اس زبان کے تخلیقی کاموں میں آپ کا نام دور دور تک نظر نہیں آتا؟

☆☆ جی ہاں پنجابی میری مادری زبان ہے۔ کسی حد تک گورمکھی رسم الخط بھی جانتا ہوں لیکن مزاج اور معاملہ چونکہ اردو زبان میرے تخلیقی ذہن پر حاوی ہے اس لیے میرا بیشتر تخلیقی اظہار اردو زبان میں ہے۔ دیوناگری اور انگریزی میں بھی

کچھ طبع زاد تحریریں منظر عام پر آتی ہیں۔ تراجم کے سلسلے میں میں نے پنجابی، ہندی، اردو اور انگریزی کی زبانوں سے یعنی چاروں زبانوں میں تراجم کیے ہیں اور وہ منزل اشاعت سے بھی سرفراز ہو چکے ہیں۔

☆ کچھ لوگ متحدہ ہندوستان کی پنجابی اور آج کے ہندوستان کی پنجابی کو مختلف گردانتے ہیں۔ آپ کے خیال میں تقسیم ہند کی شکل میں پنجابی زبان کس طرح کے تغیر و تبدل سے گذری ہے اور تبدیلی کا یہ عمل صرف پنجابی زبان تک محدود ہے؟

☆☆ متحدہ ہندوستان کی پنجابی اور آج کے ہندوستان کی پنجابی یقیناً مختلف ہو گئی ہے۔ مغربی پنجاب کی پنجابی میں اردو، فارسی اور مقامی بولیوں کے الفاظ کا نفوذ ہے اور مشرقی پنجاب میں یہاں کی زبانوں کے الفاظ در انداز ہو گئے ہیں۔ پنجابی پر لسانی اثر اس لیے اس نوع کا زیادہ ہے کیونکہ پنجاب جو ایک تھا دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے اور مختلف النوع عوامل کی زد میں آ گیا ہے بنگال کے دو حصے ہونے کے بعد ممکن ہے بنگالی پر بھی اس نوع کا اثر ہوا ہو۔

☆ آپ کے زمانے میں نظم کا شاعر اور ترقی پسندی لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ ہمارے قارئین کو اپنی ترقی پسندی کی بابت کچھ بتلایئے؟

☆☆ تقسیم ہند کے آس پاس کے برسوں میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور اگرچہ مجھ پر بھی اس تحریک کا اثر ہوا لیکن ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے مجموعہ کلام "میری نظمیں" کی اشاعت کی منزل تک پہنچتے پہنچتے میں اعلان نامے، فارمولے، طے شدہ پروگرام اور مینی فیسٹو سے آزاد ہو چکا تھا۔ میں نے "میری نظمیں" کے پیش لفظ میں کھلے الفاظ میں اپنی پوزیشن کو واضح کیا ہے۔ مجھے انسانی سروکار بہر حال عزیز تر رہے ہیں اور یہ سلسلہ شروع سے آج تک میرے یہاں جاری و ساری ہے۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسندوں پر طرح طرح کے الزام، مفادات اور باہمی اختلاف کے قصّے بھی زبان زدِ عام تھے۔ کیا آپ اس حوالے سے اپنے تجربات اور اپنی پوزیشن کی وضاحت فرمانا پسند کریں گے؟

☆☆ یہ سچ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسندوں پر طرح طرح کے الزام، مفادات اور باہمی اختلاف کے قصّے زبان زدِ عام رہے ہیں۔ مینی فیسٹو، اعلان نامے، طے شدہ پروگرام وغیرہ یہ سب ترقی پسند تحریک کا حصہ رہے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ترقی پسند تحریک کا کردار بھی کافی حد تک ان عناصر سے آزاد ہو چکا ہے۔ میں چونکہ آج تک کسی سیاسی یا ادبی تنظیم کے ساتھ بطور رکن یا عملی ممبر کے طور پر وابستہ نہیں رہا اس لیے ان کے نظم و ضبط کے قوانین سے آزاد رہا۔

☆ آج کل بڑے بڑے نظریے اور فلسفی عالمی استعمار کی ذہنی اختراع گردانے جا رہے ہیں۔ مارکسی نظریات کی بابت آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆☆ عالمی استعمار عام طور پر سوویت یونین اور امریکہ اور ان ملکوں کے حلقۂ نظریاتی دو بڑے فکر کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ سوویت یونین کے انتشار کے بعد عالمی استعمار کا تنہا صرف امریکہ رہ گیا ہے۔ مارکسی نظریات پیداواری اور اقتصادی رشتوں کو انسانی رد عمل کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ مارکسی نظریات اپنے آپ میں سیاسی نوعیت رکھتے ہیں۔ انھیں بعض اوقات ان کی موشگافیوں سمیت حصول اقتدار اور سیاسی قوت کے استحکام کے مقصد سے استعمال کیا گیا۔ اس میں مارکسی نظریات کے بجائے استعمال کرنے والوں کا قصور تھا۔ مارکسی نظریات کی اہمیت آج بھی حسب سابق قائم و دائم ہے۔

☆ نظم ایک عالمی صنفِ سخن ہے اس کی جانب آپ کی توجہ کے اسباب اور آپ کے زیر مطالعہ کون کون سے شعراء رہے اور کن کے اثرات آپ کے ہاں تلاش کیے جا سکتے ہیں؟

☆☆ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم و نثر دونوں سے کیا لیکن نظم یعنی شعر میرا پہلا عشق تھا اس لیے تخلیقی اظہار کے تعلق سے دولت نظم کو حاصل ہوئی۔ نظم کے علاوہ وقتاً فوقتاً میں غزل میں بھی طبع آزمائی کرتا رہا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے لیکن نظم کو بہر حال فوقیت حاصل رہی۔ اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم میں نے صرف آٹھویں درجے تک حاصل کی یعنی اسکول اور کالج میں بی۔ اے پاس کرنے میں سائنس کا طالب علم رہا۔ ایم۔ اے میں نے انگریزی ادبیات میں پاس کیا۔ اسکول کی سطح کی اردو کی ابتدائی تعلیم کے بعد جب میں نے اردو میں تخلیقی اظہار کو موزوں سمجھا تو میں نے اردو زبان کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور اردو میں زبان و ادب کی پوری روایت کو اپنے وجود کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ ۱۹۴۸ء کے آس پاس ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعراء کیفی اعظمی، سردار جعفری اور کچھ دیگر شعراء کے علاوہ حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ شعراء اور کچھ غیر وابستہ شعراء جن میں میرا جی، ن۔ م۔ راشد، مجید امجد، مختار صدیقی، فیض احمد فیض شامل تھے میرے زیر مطالعہ آئے اور میں نے اپنے منفرد مزاج کو برقرار رکھتے ہوئے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں محمود جالندھری اور فکر تونسوی بھی اچھے خاصے مشہور شاعر تھے۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر جب تک وہ حیات تھے میں ان کے قریب رہا اور ان سے شخصی اوصاف اور ادبی طریق کار سیکھنے کی کوشش کی۔ میرے یہاں اکتسابی مواد اپنی جگہ اہم ہے لیکن میں نے اتنا تو بہر حال قریبی زندگی کے تجربات اور مشاہدوں سے کیا۔ قریبی زندگی سے سرگرم تعلق میری شاعری کے بنیادی محرکات کا حصہ ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کو (RILKE) سے متاثر ہونے کا طعنہ بھی دیا کرتے ہیں؟

☆☆ میں نے ہندوستانی ادب اور مغربی ادب کے نظم و نثر کے اعلیٰ نمونوں اور شاہکاروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس مطالعہ کی روشنی میں ایک ہمہ

بہت کم عرصے سے روشناس ہوا ہوں میں نے RILKE کا مطالعہ ضرور کیا ہے لیکن RILKE سے متاثر ہونے کا علم صرف آپ کی وساطت سے مجھ تک پہنچا ہے اور پہلی بار ہوا ہے۔

☆ ایک جگہ آپ کو اسلوب اور مفہوم کی کلیت کا حامل یعنی (ORGANIC WHOLE) کا حامل گردانا ہے جبکہ دوسرے طبقے کے خیال میں آپ کا کلام دل میں اترنے والا نہیں؟

☆☆ اگر میں اسلوب اور مفہوم کی کلیت یعنی (ORGANIC WHOLE) کا حامل ہوں تو یہ خیال بعید از قیاس ہے کہ میرا کلام دل میں اترنے والا نہیں۔ حال ہی میں فرانس کی ایک طالبہ نے اپنا حرفِ ستائش میری نذر کیا ہے اس اعتراف کے ساتھ کہ میرا کلام جو ترجمے کی وساطت سے اس تک پہنچا ہے وہ اس کے دل میں اترا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئی ہے بہت سے اچھی طرح بھی مجھے حرفِ ستائش سے نوازتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے میرا کلام جزوی طور پر یا کلی طور ان کے دل میں اترا ہوگا۔

☆ کچھ لوگ آپ کو فکر اور جذبات سے عاری تخلیق کار بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ اگر میں فکر اور جذبات سے عاری تخلیق کار ہوں تو میں تخلیق کار ہی نہیں ہو سکتا اگر میں تخلیق کار ہوں (جس کو پچھلے ساٹھ برسوں میں قارئین و سامعین اچھی خاصی تعداد میں قبول کر چکے ہیں) تو پھر میں جذبات سے عاری نہیں ہو سکتا کیونکہ تخلیق کاری کا سارا کھیل جذبوں کا کھیل ہے یہاں تک کہ ایلیٹ کے مطابق الفاظ کو بھی جذبوں میں ڈھالنے کا کھیل ہے۔

☆ آپ کے ہاں تجربے اور مشاہدے کی طلب اور تڑپ کا بھی بہت چرچا ہے مگر دوسری طرف آپ کو سادھو سنت کی طرز کا انسان بھی گردانا جاتا ہے؟

☆☆ اس سوال سے پہلے والے سوال میں کچھ لوگوں کے حوالے سے فکر اور جذبات سے عاری جیسے الفاظ مجھ سے منسوب کیے گئے ہیں۔ اگر میرے ہاں تجربے اور مشاہدے کی طلب اور تڑپ موجود ہے تو میں فکر اور جذبات سے عاری کیسے ہو سکتا ہوں۔ ہر انسان کی طرح میں نہ خالصتاً نوری ہوں اور نہ ناری۔ حیات اور حسن کی جادوگری سے اکثر فکر و تڑپ کی حد پار کر جاتا ہوں اس لیے اس جنم یا اگلے جنم میں بھی میرے سادھو سنت بننے یا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

☆ بازارِ حسن کا طواف ایک تخلیق کار کے لیے تجربہ کی مانند ہوا کرتا ہے مگر وہاں سے واپسی پر کیبن میں منہ چھپا کر رونا کس طرح کی انکساری کی نشان دہی کر رہا ہے؟

☆☆ میں ہر تخلیق کار کی طرح حسن کا پرستار تو ہوں مگر حسن کا خریدار ہونا یا بننا میرا شعارِ زندگی قطعی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اگر میں کیبن میں سر چھپا کر رو رہا تھا تو میں ہی رونے والا تھا اور میں ہی رونے کے واقعہ کا شاہد۔ فکر تونسوی شاعر ہونے کے علاوہ طنز و مزاح کے بھی شہسوار تھے۔ کبھی کبھی کچھ الفاظ کا استعمال وہ زیبِ داستاں کے طور پر بھی کرتے تھے۔

☆ اچھے شعر پر داد دینا اہلِ مذاق کی دلیل ہے مگر داد دیتے ہوئے آبدیدہ ہو جانا یا مقابل کا منہ چوم لینا بھی عجب لگتا ہے کہیں اس کے ڈانڈے بھی آپ کی نفسیاتی کشمکش سے تو نہیں ملتے؟

☆☆ جذباتی ہونا یا جذباتی طور پر سُر کی کائنات میں شامل ہونا کوئی بری بات نہیں۔ اس کیفیت کا اظہار شائستہ یا غیر شائستہ دونوں صورتیں اختیار کر سکتا ہے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں کبھی جذبات کے وشکاف غیر شائستہ اظہار کا مرتکب نہیں ہوا میں بہرحال کسی نفسیاتی کشمکش کا شکار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی کشمکش سے میرے کسی فعل کے ڈانڈے ملتے ہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کی نظموں کو ذاتی المیوں سے تعبیر کرتے ہیں مگر اکثریت آپ کے المیوں سے بےخبر ہے؟

☆☆ اگر کوئی نظم ذاتی المیوں کے ذکر تک محدود ہو جاتی ہے تو وہ شعر کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہے۔ اگر میری کوئی نظم المیاتی ہے تو بھی میری نظم بطور نظم اگر المیہ کی جسمانی حدود سے ماورا نہیں جاتی تو وہ نظم نہیں ہو سکتی۔ میں ایلیٹ کی اس رائے کو صحیح مانتا ہوں کہ شعر کی سوانحی حدود سے ماورا جانے کی قوت اس کی اصل یعنی شعر کی اصل معروضی قوت کی پہچان ہے اچھی شاعری معروضی انداز میں سوانحی تفصیل سے ماورا پھیلاؤ تشکیل کرتی ہے۔

☆ آپ کو ازلی معمہ کا شاعر کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ حیات و مرگ اور کائنات ازلی اور ابدی معمہ ہے۔ اگر میں اس معمے کا شاعر ہوں تو یہ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔

☆ احباب نے آپ کے سر ادب کی ماہیت دریافت کرنے کا سہرا تو باندھ دیا مگر اس کی وضاحت اور صراحت بالکل نہیں کی گئی کہ آپ کس قسم کی ماہیت دریافت کرنے میں مصروف و مشغول ہیں؟

☆☆ ادب کی ماہیت دریافت کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں اور دیگر ممالک میں بہت سے دانشور موجود ہیں۔ میں بطور شاعر بھلا کیوں یہ مصیبت اپنے سر لوں گا۔ بطور شاعر میں صرف زندگی کے جملہ امور و حقائق اور ان کی غیر دریافت شدہ ماہیت کے ہنگام میں زندگی کی کوئی کرن تلاش کر رہا ہوں۔

☆ وقت گزرنے کے ساتھ آپ کی نظموں میں گرہ پیچی سے زیادہ نامانوس اور پیچیدہ مسائل ابھارتے نظر آ رہے ہیں؟

☆☆ وقت گزرنے کے ساتھ حیات و کائنات کے تمام تر مسائل پہلے سے کہیں زیادہ نامانوس اور پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ میں بطور شاعر چونکہ قریبی زندگی اور

گردو پیش سے منسلک ہوں اس لیے میرے ہاں وہاں سے نامانوس اور پیچیدہ مسائل کا سر ابھارتے نظر آنا عین فطری ہے۔

☆ ایک زمانے میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ الفاظ اور معنی عدم توازن کا شکار ہیں۔ اوّل وہ کون سے حالات تھے جن کے باعث آپ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئے دوئم یہ کہ آج آپ کی سوچ میں صرف الفاظ معنی بلکہ مجموعی طور پر کس پیرو سوچ کی حامل ہے؟

☆☆ میں عام فہم میں آنے والے انداز میں بات کرتا ہوں۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ کون سا زمانہ تھا جب میں نے کہا تھا کہ الفاظ اور معنی عدم توازن کا شکار ہیں حق بات یہ ہے کہ الفاظ اور معنی ہمیشہ عدم توازن کا شکار ہوتے ہیں۔ الفاظ اور معنی کے لیے عدم توازن کا کوئی مخصوص زمانہ نہیں ہے البتہ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ عدم توازن کی صورت حال میں بہ حد مقدور توازن قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

☆ آپ کو روایت کا امانت دار بھی شمار کیا جاتا ہے مگر ہم اس باب میں بھی تشفی کرتے ہیں کہ آپ کس روایت کے امین ہیں؟

☆☆ انسانی معاشرے میں انسانی ہمدردیاں کہیں کہیں جزیروں کی طرح آباد ہیں اگر میں کسی روایت کا امانت دار ہوں تو انسانی ہمدردیوں کی تمازت انگیز لمس کا اور ان کی حیات افروز کیفیتوں کی روایت کا امانت دار ہوں۔

☆ آپ کے انحرافی رویوں کا ایک زمانے میں خوب چرچا رہا ہے مگر کسی نے ان چیزوں کی نشاندہی کبھی نہ کی جن سے آپ انحراف کرتے رہے ہیں؟

☆☆ میں ہمیشہ "کہنے" سے انحراف کرتا رہا اور کرنے کو "کہنے" پر ترجیح دیتا رہا۔ کچھ شاعر انسانی تجربے کو بیان اور اعلان کی صورت میں پیش کرتے ہیں جبکہ دوسرے انسانی تجربے کو اس کی تجسیم، تشبیہ، استعارے، علامت اور تخلیقی پیکر کے ذریعے جسمانی حدود سے ماورا وسعت بال و پر عطا کرتے ہیں۔

☆ نظم کے اکثر شعرا غزل کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے مگر غزل کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ آپ کی غزل بھی نظم کی طرح الگ مقام کی حامل ہے مگر غزل کی بابت آپ کی رائے کیا پابندی یا آزادی ہے؟

☆☆ میں نظم کے ایسے شعرا کی صحیح تعداد کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن نظم کے تین ایسے شعرا کو جانتا ہوں جو غزل کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور غزل کہتے بھی نہیں۔ یہ تین شعرا ہیں۔ اختر الایمان، حبیب الرحمن اور ستیہ پال آنند۔ یہ تینوں شاعر کھلم کھلا اور مختلف موقعوں پر غزل کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے پہلے دو کی کچھ نظموں کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ غزل کی ساخت سے زیادہ قریب ہیں بلکہ یہی نظمیں عنوان دے کر نظم کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ ستیہ پال آنند کسی زمانے میں غزل میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن فی الوقت وہ صنف غزل کے سخت مخالف ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نہ تو کلیم الدین احمد کی طرح غزل کو نیم وحشی صنف سخن سمجھتا ہوں اور نہ ہی غزل کی گردن مارنے کے لیے آتش کی طرح موضوعاتی شاعری اور قافیہ پیمائی کے جبر کو غزل کے ساتھ منسوب کرتا ہوں۔ غزل سراسر تہذیبی اظہار کی صنف سخن ہے اور اس کی دل آویزی اور کشش ہمیشہ قائم و دائم رہے گی یہ الگ بات ہے کہ انفرادی امتیاز حاصل کرنے کا خواب بہت کم غزل کہنے والے شعرا کے ہاں دائرہ تعبیر کی حدود تک پہنچ سکا۔ یہ آپ کی فراخدلی ہے کہ آپ میری غزل کو بھی میری نظم کی طرح الگ مقام کی حامل سمجھتے ہیں۔ میں اپنے انکسار میں خوش ہوں۔

☆ مشاعرے اردو زبان و ادب کی روح بلکہ جان ہیں جبکہ آپ انھیں شاعری کے لیے مہلک گردانتے ہیں حالانکہ اسی مشاعرے نے تقسیم ہند کے بعد دونوں جانب کے اہل قلم کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے سر انجام دیا تھا؟

☆☆ اچھا اور بڑا شعر اچھی اور بڑی نظم تہہ در تہہ کیفیات اور معانی کے حامل ہوتے ہیں۔ مشاعرہ شعر کی اس نوع کی بھرپور ترسیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اور جب شعرا شعر پیش کرتے وقت اپنی پیش کش میں اداکاری اور گلوکاری شامل کر دیتے ہیں تو مشاعرے کی فضا اور معیار دونوں مجروح ہو جاتے ہیں۔ یہ صورت حال مہلک ہے یا قابل داد میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ صحیح ہے مشاعرے نے تقسیم کے بعد دونوں جانب کے اہل قلم کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے سر انجام دیا ہے۔ اہل قلم میں چونکہ نثر نگار بھی ہوتے ہیں اس لیے ان کے لئے بھی ایسے اداروں یا INSTITUITIONS کی ضرورت ہے جو ان کے درمیان زنجیر کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں۔

☆ آپ کا شمار آزاد نظم کے حامیوں میں کیا جاتا ہے آزاد نظم برصغیر کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے کیا نیز آزاد نظم کا مستقبل اردو ادب میں کیا ہے؟

☆☆ میں آزاد نظم کا حامی ہی رہا ہوں کیونکہ میں نے آزاد نظم میں ہی حاوی انداز میں تخلیقی اظہار کیا ہے لیکن میں آزاد نظم اور صرف آزاد نظم کا ہو کر نہیں رہا میں نے آزاد نظم کے علاوہ پابند نظم، معرا، نثری نظم اور جاپانی اصناف سخن۔ ہائیکو، تانکا، سیدوکا وغیرہ کے علاوہ صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے اگر آپ رسائل کی ورق گردانی کریں تو آپ دیکھیں گے ان دنوں بیشتر اردو شعرا آزاد نظم کے فارم میں ہی اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ کچھ مکمل رکن سے مصرع شروع کرتے ہیں اور حسب ضرورت بحر کے زحاف پر مصرع ختم کرتے ہیں کچھ مصرع مسلسل یعنی RUNON LINE کی صورت میں نظم کی ڈرافٹنگ کرتے ہیں ستیہ پال آنند اکثر کامیاب انداز میں RUNON LINE سے استفادہ کرتے ہیں کچھ اور بھی HYBRID صورتیں ہو سکتی ہیں۔ نثری نظم مکمل طور پر آزاد نظم کی مثال ہے آزاد نظم آہستہ آہستہ شعری نشستوں اور مشاعروں میں بھی جگہ پانے لگی ہے۔ لہذا آزاد نظم کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

☆ کیا آپ ابتدا سے اب تک اچھی اور غیر فانی نظمیں کہنے والے تخلیق

کاروں کے ناموں سے باخبر کر سکتے ہیں۔ نیز ان نظموں کا مستقبل برصغیر سے باہر بھی کچھ ہے یا نہیں؟

☆☆ کسی تحقیقی متن سے گزرے بغیر فوری طور پر میں جن تخلیق کاروں کے نام لے سکتا ہوں ان میں اقبال، فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد، میراجی، تصدق حسین خالد، مجید امجد، وزیر آغا، سردار جعفری، یحییٰ اعظمی، مخدوم محی الدین، شہریار، گلزار، ستیہ پال آنند شامل ہیں۔ مزید غور و خوض کے بعد کچھ مزید نام بھی اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ اقبال، فیض، راشد، مجید امجد، وزیر آغا، سردار جعفری، یحییٰ اعظمی، مخدوم محی الدین، شہریار، گلزار، ستیہ پال آنند اپنے کلام کے ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں میں تراجم کے ذریعے ان زبانوں کے قارئین تک پہنچ چکے ہیں اور ان زبانوں کے قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ خاکسار کی منتخب نظموں کے تراجم بھی بہت سی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جوں جوں تراجم کا دائرہ وسیع تر ہوگا اردو شعرا کا حلقہ قارئین بھی اسی تناسب سے وسیع تر ہو جائے گا۔ آپ نے غزل کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اقبال، حافظ (پیام میں نے انگریزی کے تراجم کے حوالے سے شامل کیے ہیں) فیض کا معاملہ الگ ہے۔ ان کو اچھے مترجمین نصیب ہوئے۔ باقی کے کامیاب غزل گو شعرا کو اچھے مترجمین کا انتظار کرنا ہوگا۔

☆ اردو افسانے سے آپ کی ملاقات کس تخلیق کار کے ذریعے ہوئی اور آپ نے پہلا افسانہ کس جذبے یا احساس کے تحت تحریر کیا؟

☆☆ میں نے ادبی سفر کا آغاز نظم و نثر دونوں سے کیا تھا۔ شروع میں میرے دو ایک افسانے دو چار نسبتاً بڑے رسائل میں شائع بھی ہوئے تھے لیکن صنف نظم چونکہ مجھ پر حاوی ہو گئی اس لیے ۱۹۶۲ء تک میں کلی طور پر نظم اور دیگر شعری اصناف کی تخلیق کی طرف متوجہ رہا۔ فکشن کا مطالعہ، اردو فکشن اور مغربی فکشن دونوں کا مطالعہ، شعری اظہار کے ساتھ ساتھ جاری رہا۔ اردو زبان کے جن افسانہ نگاروں کا میں نے انتخاب کر کے بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، غلام عباس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میری کسی افسانہ نگار کے ساتھ ملاقات اگر ہوئی بھی تو بہت سرسری۔ یہ میرا اپنا جذبہ تخلیق تھا جس نے مجھے افسانہ لکھنے کی جانب راغب کیا۔ میں نے ایک کے بعد ایک اور اب تک چودہ افسانے لکھے جن پر مشتمل مجموعہ ۱۹۸۳ء میں "آنکھیں اور پاؤں" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ میرا پہلا افسانہ اور بعد کے بیشتر افسانے قریبی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے منسلک ہیں۔ "آنکھیں اور پاؤں" کی اشاعت کے بعد میں ایک بار پھر نظموں کی جانب لوٹ گیا۔ لمبے وقفے کے بعد میں نے "نئے جوتے اور مٹی کا بوجھ" کے عنوان سے دو نئے افسانے لکھے۔ ممکن ہے "آنکھیں اور پاؤں" کے نئے ایڈیشن میں یہ افسانے بھی شامل ہوں گے۔ میرے افسانے "کنواں" کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی ہے۔ انگریزی کے علاوہ اس افسانے کے تراجم کم و بیش تمام ہندوستانی زبانوں کے علاوہ اطالوی اور جاپانی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

☆ آپ اپنے افسانوں میں سوالات بڑی شدومد سے اٹھاتے ہیں مگر اُن کے جوابات اس طرح سے پیش نہیں کرتے جس کے باعث قاری کی تشفی ہوتی ہے یا تسلی؟

☆☆ میں سوالات نظموں اور افسانوں دونوں اصناف میں اٹھاتا ہوں۔ جوابات فراہم کرنا فنکار کا کام نہیں ہے۔ اگرچہ پریم چند کی فکشن میں اور کچھ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فکشن میں سوالات کے جواب اور مسائل کے حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فنکار کا اصل کام قاری میں تجسس اور تحرک پیدا کرنا ہے تا کہ وہ سوالات اور مسائل کے ساتھ براہِ راست نبرد آزما ہو سکے۔

☆ آپ نے افسانوں میں مختلف آہنگ اور پیرایے اپنائے ہیں اگر یہ عمل دانستہ ہے تو اس کے فوائد بتلایئے وگرنہ اس کی وجوہات جاننا قاری کا حق بنتا ہے؟

☆☆ جی ہاں! میں نے افسانوں میں متعلقہ صورت حال کے مطابق آہنگ اور پیرایے کی صورتوں کو وضع کیا ہے۔ قاری پڑھتے وقت ذہنی اور جذباتی شرکت سے اپنی صوابدید کے مطابق ترسیل کے مراحل طے کر سکتا ہے۔ اس کا سیدھا سادا اور بندھا ٹکا کوئی سکہ بند فارمولا نہیں ہے۔

☆ تنقید کی جانب آپ کی توجہ کب اور کیونکر ہوئی نیز آپ نے کن تنقید نگاروں کو پڑھا ہے اور آپ تنقید کے کس دبستان سے منسلک ہیں؟

☆☆ ۱۹۴۸ء میں اپنی نظم "اکیلی" کی اشاعت کے آس پاس کے دنوں میں میں اپنا کلام احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور محمود جالندھری پر INFLICT کیا کرتا تھا۔ ان مشاہیر کے نام میں جو خط لکھتا تھا ان میں جو کچھ میرے زیر مطالعہ آتا تھا اس پر اپنی رائے بھی دیتا تھا۔ ان کا ردعمل میرے لیے بڑا حوصلہ افزا ہوتا تھا۔ جوں جوں میرے مطالعے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا میں نے تحریری طور پر مضامین کی صورت میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ میں کسی تنقیدی دبستان سے وابستہ نہیں ہوں۔ میری تنقیدی تحریریں اور مضامین زیادہ تر عصری ادب کے مطالعوں پر مبنی ہیں۔ میں نے تمام ملکی، غیر ملکی اہم ناقدین کو بے حد شوق سے پڑھا ہے اور سیکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

☆ کچھ لوگ اردو زبان اور اردو ادب کے زوال کا ذمہ دار ناقدین کے جانب دارانہ رویے کو ٹھہرایا کرتے ہیں۔ آپ کی رائے اور پوزیشن اس حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ کیا اردو زبان اور اردو ادب واقعی زوال کی زد میں ہیں۔ اگر مجموعی طور پر صورت حال زوال کی صورت حال ہے تو اس زوال کو چند ناقدین کی

تحریروں کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ جب معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے تو تمام سماجی ادارے اور ثقافتی منصوبے اور عملی کام زوال کی زد میں آجاتے ہیں۔ یہ بڑا پیچیدہ معاملہ ہے اس لیے چند افراد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

☆ آپ کی عمر میں اکثر احباب فراقِ ماضی میں گرفتار ہوا کرتے ہیں جبکہ آپ ماضی کی زنجیروں سے رہائی کے خواہش مند ہیں۔ کونسا ماضی؟ ماضی قریب کہ ماضی بعید؟

☆☆ عملی طور پر میں لمحہ موجود میں ہی ماضی اور مستقبل کی سیاحت کرتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں نے کسی بھی نوعیت کے ماضی کا کوئی بھاری بھر کم گٹھڑ سر پر نہیں اٹھا رکھا۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ وسائل کے باوجود مجھے کافی حد تک ذہنی اور جسمانی آزادی میسر ہے۔

☆ آپ کی نسل کے بعد اردو زبان اور اردو ادب کا مستقبل بالخصوص بھارت میں کس طرح نظر آتا ہے؟

☆☆ اردو زبان اور ادب کی کشش میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن اس کشش سے براہ راست فیضیاب ہونے والے لوگ تعداد میں کم ہوتے جائیں گے لیکن یہ بڑا اہم ہے کہ ذریعے اردو زبان اور اردو ادب دوسری زبانوں میں اپنا حلقہ احباب قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ فلمی میڈیا نے ہندوستان میں اردو زبان کی ترویج و ترسیل میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ امید ہے معمولی رد و بدل کے ساتھ یہ عمل آئندہ بھی جاری رہے گا۔

☆ بھارت کے الیکٹرانک میڈیا نے اچانک اور ڈرامائی طور پر جس قدر تیزی سے اردو طب و لہجہ اور تہذیب و تمدن کو اپنایا ہے آپ کے خیال میں اس کے پیچھے کیا مقاصد پوشیدہ ہو سکتے ہیں؟

☆☆ فلمی میڈیا کا ذکر میں کر چکا ہوں ٹی۔وی کا دائرہ فلم سے بھی وسیع تر ہے فلم اور ٹی۔وی سے وابستہ ادارے خالصتاً کاروباری ادارے ہیں۔ اردو طب و لہجہ اگر انہیں ناظرین اور سامعین کی تعداد بڑھانے میں مدد کرتا ہے تو وہ اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

☆ اہل دانش اسے بھارتی حکمرانوں کی علاقائی سیاست اور عوام کے ذہنوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش سے منسوب کرتے ہیں؟

☆☆ کون اہل دانش اور کون سے بھارتی حکمران۔ اہل دانشور وہ ہوتا ہے جو جہاں تک ممکن ہو سکے ہر قسم کے تعصب سے اوپر اٹھ کر معاملات پر نظر ڈال سکے اور معروضی انداز میں نتائج اخذ کر سکے۔ اس معیار کا دانشور اب کہاں ملے گا۔ بھارت جمہوری نظام کے باعث مستقل طور پر کسی ایک حکمران کے تابع نہیں ہے۔ حکمران بدلتے رہتے ہیں اور ان کے مقاصد بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جب طاقت ایک قسم کے حکمرانوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو ناقدین اور حکمرانوں کے درمیان باہم دگر مقاصد کی وجہ سے انتہائی پست سطح کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔ ظاہر ہے اس عمل میں علاقائی سیاست کا بھی دخل ہے۔ عوام کے ذہنوں پر کون کس انداز سے اثر انداز ہوتا ہے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔

☆ انڈو پاک کے اہل قلم بلکہ عوام کے درمیان پائیدار دوستی امن اور محبت کے رشتے استوار ہونے کے امکانات کب تک اور کتنے فیصد ہیں؟

☆☆ اس تعلق سے تاریخ اور تناسب مقرر کرنا ناممکن ہے۔ کوشش بہر حال سچے دل سے جاری رہنی چاہیے۔ سسی فس (SISY PHUS) کا کرب کوئی کھوکھلا کرب نہیں ہے۔ اس کرب سے گزرنا مسلسل اور متواتر گزرنا سسی فس کا مقدر ہے۔ انڈو پاک کے اہل قلم کا بھی یہی مقدر ہے۔

☆ عالمگیر تہذیبی فساد اور اس کے تجربے کی کڑیاں کب کہاں اور کس طور ملائی جا سکتی ہیں اور ان کے خاتمے کے لیے کیا کچھ عمل میں آنے کو بیتاب ہے؟

☆☆ عالمگیر تہذیبی فساد نے انتشار اور ٹوٹنے بکھرنے کی فضا پیدا کی ہے جس میں ٹوٹنے بکھرنے کا عمل روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ دور ہجوم تغیرات کا دور ہے اور اس دور میں تغیرات کی رفتار پہلے سے کئی گنا تیز تر ہے۔ تمام بڑی اکائیاں چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹ رہی ہیں۔ ہر ذرہ مرکز سے ٹوٹ کر آزاد ہونا چاہتا ہے اپنی منفرد پہچان پر اصرار کر رہا ہے۔ ٹافلر (TOFFLER) کا خیال ہے یہ چھوٹی چھوٹی اکائیاں اپنی پہچان بنانے کے بعد باہمی روابط کے لیے نئے سرے سے ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں گی اور باہمی رشتوں کا مثبت امکان ایک بار پھر دائرہ امکان میں آجائے گا۔

☆ آخر میں آپ ہمارے قارئین کو اپنی خواہشات، ارادے اور منصوبوں کی بابت بتلائیے جو آپ کے دماغ، قلم اور میز پر ترتیب پا رہے ہیں؟

☆☆ زوال عمر میں اشیاء کو دیکھنے کا تناظر بدل جاتا ہے۔ میرے پاس لکھنے پڑھنے کی بابت ایک مخصوص میز ہے۔ دماغ اور قلم بھی کچھ کرنے کے لیے بے قراری کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ لیکن میں لکھنے پڑھنے کے کسی مخصوص میز یا قلم کا تابع نہیں ہوں۔ جب اندر سے آواز آتی ہے تو کسی بھی مناسب جگہ پر بیٹھ کر کسی بھی مناسب قلم سے لکھ سکتا ہوں۔ وہ جو میری مخصوص لکھنے کی میز ہے اس پر عام طور پر باہم دگر کتابوں، کاغذوں اور چیزوں کا ہجوم رہتا ہے اس میز پر فساد کی وہی صورت ہے جس کا عالمگیر فساد کے تعلق سے آپ نے اپنے آخری سوال میں ذکر کیا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً فساد کی اس صورت حال میں ترتیب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ میرے وجود میں بھی ایک سسی فس ہے جو متواتر اور مسلسل مجھے سعی مسلسل کے لیے آمادہ کرتا رہتا ہے۔ یہ تحریر میں اگرچہ خرابی کی صورت مضمر ہے لیکن ہر خرابی کی صورت میں بھی امکان تعمیر موجود ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ہنگامہ رکھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہوں۔

چھوٹی خوشی بڑا آنسو

فکر تونسوی

بلراج کومل شریف ہے۔
بلراج کومل ذہین ہے۔

اگر یہ دونوں خاصیتیں ایک شخص میں اکٹھی ہو جائیں تو ہم اسے استثناء کہہ کر درگزر کر دیتے ہیں۔ کیا کیا جائے مستثنیات ہمارے بس کی بات تو نہیں۔

لیکن عام طور پر ان دونوں کا ٹکراؤ ایک شخصیت کا المیہ بن جاتا ہے کیونکہ شریف آدمی آسانی سے بیوقوف بن جاتا ہے اور ذہین آدمی آسانی سے بے وفا بن سکتا ہے۔ اگر بیوقوفی اور بے وفائی کا یہ تضاد بلراج کومل میں موجود ہے تو بلراج کومل انسان ہے یا اس کا المیہ ہے۔

کیا وہ استثناء ہے؟
کیا وہ المیہ ہے؟

اس سوال کی کھوج میں بلراج کومل کے باطن کو دور اور قریب ہو کر دیکھا تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ بیک وقت شریف اور ذہین تو لگتا ہے مگر درمیان میں وہ المیہ غائب ہے۔ یعنی یہ اندازہ ہی غلط ہو گیا۔ وہ بیوقوف بن سکتا ہے مگر اسے بنانا کوئی نہیں ہے۔ وہ بے وفا ہو سکتا ہے مگر کسی کو بنانا نہیں اس کی طبیعت ادھر نہیں آتی۔

البتہ یہ اس تضاد کا المیہ ضرور ہے کہ وہ بلراج کومل کی شخصیت کا حصہ بنا تو اپنی اور جتنی ہی کو ہی سنبھال لی۔ شرافت میں کیا تُک! اگر کوئی بیوقوفی پسند ہی نہ کرے۔ اور ایسی ذہانت بھی کیا ضرور جس سے کوئی بیوقوف بن ہی نہ سکے۔ اس سے تو بہتر تھا وہ نہ شریف ہوتا نہ ذہین۔ بس پیدا ہوتا۔ کھاتا پیتا پھر مر جاتا اور دنیا سے چلا جاتا

سوچا بلراج کومل کم نصیب ہے۔ اس کا خمیر اٹھانے میں قدرت سے ضرور کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ کیا یہ بات بھی ناقابل برداشت ہے کہ قدرت کی غلطیاں منصوبہ بند ہوتی ہیں۔

مگر منصوبے میں ایک تیسری چیز بھی شامل ہو گئی۔ شاعری اور شاعری بھی وہ جس کا افق ایک پھیلا ہوا اور کل ہے۔ شرافت، ذہانت اور شعریت کی یہ تکون؟ وہ المیہ تو غائب ہو گا اس تکون میں سے ایک بلراج کومل وجود میں آتا ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس کی شخصیت المیہ ہونے کے باوجود المیہ نہیں رہتی۔ اس تکون کو ہم کوئی نام نہیں دے سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اسے بلراج کومل کہہ سکتے ہیں۔

وہ حماقت کی حد تک جذباتی ہے۔ ذہانت کے باوجود جذباتی ہے اور شعریت کے باعث تو جذباتی ہے ہی، چنانچہ جذباتیت کے اس اتھاہ ٹھاٹ کے سبب اُسے سمجھتے سمجھتے اکثر کنفیوژن پیدا ہوا۔ لیکن جب بھی دو چار منٹ کے لیے ہی سہی بلراج کومل سے ملاقات کی کنفیوژن بیٹھ کا فور ہو لیا کافور ہے بھی مجھ میں نہ آ سکی۔ مگر سمجھنے کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ یہ کیا؟ یہ کیوں؟ یہ کیسے؟ بلراج کومل کے پاس بیٹھتے ہی مر جاتے ہیں۔ بس ایک ہی لہر آتی جاتی رہتی ہے کہ اس شخص سے پیار کیا جائے۔ پیار لیا جائے۔ پیار دیا جائے۔

یہ شاید ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے جب لاہور میں بلراج کومل سے ملاقات ہوئی اور آج ۱۹۷۹ء کا سن ہے جب بھی مقدر وزراج کی بدقسمتی سے وہ بلراج کومل شاعری کی خوش قسمتی سے بدستور زندہ ہیں۔ زندہ رہنے کی ہی ٹریجڈی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بدستور ملتے رہتے ہیں اور اگر نہیں بھی ملیں، یعنی نہ ملیں تو بھی ایک دوسرے کے اندر زندہ رہتے ہیں۔ گھنٹوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہیں لیکن گفتگو جاری رہتی ہے۔ میں یہاں ایک دوسرے سے عشق کا پروپیگنڈہ نہیں کر رہا کیونکہ میں ہی نہیں عشق تو اس سے سبھی کرتے ہیں۔ اُف سے کی تک بھی۔ پہلا حرف لہجہ اس کا ستواں ہے وہ بھی جو اس کی شاعرانہ علامتوں کو اپنی گرفت سے باہر سمجھتے ہیں اور وہ بھی جو اس کی نظمیں جھوم جھوم کے سناتے ہیں۔ (جلسے پڑھیں۔ جب بھی جھومتے ہیں)

مگر میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ چونتیس سال کا یہ عرصہ جس کے دوران ہمارے زندگی کی گلی تیوں میں سے ایک پورا طوفان گزر گیا۔ پورا بلراج کومل گزر گیا اور فکر تونسوی تو اپنے ہی ہاتھوں سے آپ نکل کر گزر گیا۔ مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کی گلی سے نجات نہیں پا سکے۔ کیوں نہیں پا سکے مجھ میں نہیں آتا۔ البتہ کبھی کبھی شک ضرور گزرا ہے کہ ـــــــ

ـــــــ کہ یہ بھی عجیب شخص ہے جس کی اتنی طویل استقامت! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ کوئی تو کہے بلراج کومل بوگس ہے۔ سنسنی ہے۔ آوارہ ہے۔ اور اگر کوئی نہیں کہتا تو مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ غصہ بھی آتا ہے۔

ان دنوں میں لاہور کے ماہنامہ "ادب لطیف" میں متعین تھا۔ ایڈیٹری بھی کرتا تھا، چپڑاسی گیری بھی (یہ جملہ [illegible]) اچانک ایک دن بلراج کومل دفتر میں داخل ہوا۔ ان دنوں یہ دفتر ادب کا قبلہ و کعبہ سمجھا جاتا تھا۔ اور میں اس کا مجاور بن کر بیٹھا تھا۔

بلراج کومل آنکھوں میں کچھ سپنے لئے سہمے پن میں گھلا ہوا کچھ گھبرایا ہوا۔ مگر پیشانی پر باطنی اعتماد کی لکیر۔ بولا "فیروز پور سے آیا ہوں شاعری کرتا ہوں۔"

میں نے مصنوعی عظمت سے جس کا چلن ادبی اداروں میں عام رواج تھا، کہا "شاعری کوئی بری چیز نہیں۔ ادبِ لطیف ہے۔ نظم دے جائیے معیار پر پوری اتری تو شائع ہو جائے گی۔"

یوں لگا، یہ جواب اُسے غیر شریفانہ لگا۔ شرافت بلراج کومل کی جنم

جمالیات کی کمزوری ہے۔ مجھے اس کے جسم جمالیات پر رحم آ گیا۔ نظم کو فائل میں رکھنے پر وہ احتجاجاً تڑپ اٹھا۔

"حضور! آپ اسے ملاحظہ تو کر لیجئے۔"

"کوئی نیا تخیل؟ چونکا دینے والا؟"

"نظم ہی ہے لیکن۔"

بلراج کومل کے لہجے میں ایک جھنجھلاہٹ تھی۔ ذرہ نوازی، ظاہر ہے میں نے نظم کا پہلا مصرع پڑھا، دوسرا اور پھر تیسرے پر کہا "آپ اس دوسری کرسی پر آ جائیے۔ جس کرسی پر بیٹھے ہیں اس پر دھول جمی ہے۔"

وہ متانت سے مسکرایا۔ نظم بغل میں دبا کر اٹھا اور پھر چند لمحات بعد جیسے مصالحت ہی کر لیجئے تو وہ آتا گیا۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا

"کیا آپ کل بھی مجھ سے مل سکیں گے"

اس کی آواز میں اپنائیت کی ایک لہر ابھری ہوئی لہر تھی جو دو انسانوں کو پہلی نظر میں ہی اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ آواز جس میں غیریت کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی

چوبیس برس بعد آج بھی بلراج کومل کی وہ مہر قائم ہے۔

اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ ایک اضافہ ہوا ہے۔ احترام کا اب آنکھیں اس سے ملتی ہیں۔ پیغام عشق دیتی ہیں۔ مگر احترام سے جھک بھی جاتی ہیں۔

شاید بلراج کومل کو تخلیق کرتے وقت خدا سے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔

بلراج کومل کے احباب کا ایک حلقہ ہے (دنیا میں ہر انسان کا ہوتا ہے) جس میں چھچھورے بھی شامل ہیں اور گھٹیا چوکیدار بھی اور دونوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ جو دوست قدرے بے تکلف ہیں وہ دوستی کی سطح پر گالیاں سنانا اور سننا چاہتے ہیں۔ خود بلراج کومل چاہتا ہے کہ گالیوں کی سطح پر اتر آئے مگر سطح میں تمام سانچ آ جاتا ہے۔ احترام زیادہ مقدس ہے۔ نیا دھرو انگیز۔ گالیاں محسوس کر دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی بے تکلفی میں گالی نکالے تو بھی تو وہ اسے اتنا مہذب بنا دے گا کہ اس میں جان ہی نہیں رہے گی۔

اس احترام و تہذیب پر بلراج کومل کو ہمیشہ کبھی افسوس ہوتا رہا ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک دوست سے کہا کہ "بلراج کومل پر مختصر تبصرہ کرو۔"

وہ کم بخت ایک دم مہذب ہو گیا۔ بولا "یار وہ شاعر ہے مگر لگتا نہیں۔"

"کچھ تشریح"

"اس کے لباس اور رہن سہن میں تبدیلی نہیں ہے کہ لاابالی نہایت توازن سے باندھے گا نفاست سے گرہ لگائے گا۔ بوٹ پر اس خوبصورتی سے پالش کرتا ہے کہ بوٹ بھی ہنستا ہے۔"

"شاید وہ چاہتا ہو کہ بوٹ کو کسی کی ٹھوکر کا حق ہے اور آگے چلئے۔"

"نہ وہ غیر معمولی حد تک بال بڑھاتا ہے نہ بکھرا کر کوچہ جاناں کے چکر لگاتا ہے۔ کسی لڑکی سے اشتہاری عشق نہیں کیا۔ ٹھنڈی آہیں۔ اگر شاعری لولیٹو وغیرہ جو خاص قسم کا عاشقانہ رہا ہے۔ آوارگی تک نہیں کر سکتا۔ بڑے سے کو کھاؤ کا آدمی ہے۔ بھلا آدمی بھلا شاعر لگ سکتا ہے"۔

مگر پھر ایک سرد آہ بھرتے ہوئے وہ دوست بولا "مگر یار شاعر بڑے کینڈے کا ہے۔ کرب کی لے بڑی گہری اور گہری ہوتی ہے۔"

مگر اس کے تابع اور دونوں قسم کے دوستوں کو یہ بات شاید اکیلے سے جوڑ لگے کہ وہ خوب آوارگی کرتا رہا ہے۔ گھنٹوں بلا وجہ گھومتا رہا ہے۔ کناٹ پلیس کی ریلنگ پر کھڑے ہو کر حسیناؤں کو بھی تکتا رہا ہے۔ دوستوں کے ساتھ شکستہ ریستورانوں میں دھوم دھڑکی ہوئی دری پر بیٹھ کر اور کوٹ پتلون سمیت سوتا بھی رہا ہے۔ رات کے دو دو بجے تک سڑکوں میں سرشار، گنگناتا اور اپنی کیفیت سے ڈوڈو میں بھی کرتا رہا ہے۔ عالم آوارگی اور بے خودی میں اسکوٹر پر کسی دوست کو دعوت بھی دیتا رہا ہے۔ بلکہ ایک دو دوست تو اسے ایک بار بالا خانے پر بھی لے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں جا کر وہ اداس ہو گیا تھا اور گھر آ کر گھنٹوں تکیے میں منہ چھپا کر روتا رہا تھا۔

اس کے باوجود وہ عام زندگی میں نفاست اور حسن کا خوگر ہے۔ وہ نہ ان شاعروں کی طرح ہے جو زندگی بھر محبوب کے بغیر عاشقانہ شاعری کرتے رہتے ہیں اور نہ ان شاعروں کی طرح جو ہر چیز کر کے اپنی ہر چیز (جسے وہ تخلیق تک کہہ دیتے ہیں) کیش کرا لیتے ہیں۔ روایت کو بھی عاشقانہ شاعری کو بھی وہ لباس کو بھی شیخ کے ترنم کو بھی موسیقی کے ستار کو بھی حتیٰ کہ مشاعرے میں پہنائے جانے والے ہار کو بھی۔

ہاں ان معنوں میں وہ اچھا شاعر نہیں لگتا وہ اپنی کسی کوتاہی کا استحصال نہیں کرتا۔ کرنا چاہیے بھی نہیں۔ کر سکتا بھی نہیں کیونکہ وہ استحصال کے مفہوم سے ہی قطعی محروم ہے۔ ان معنوں میں اگر آپ اس کو شاعر نہیں کہنا چاہتے تو بھی وہ شاعر رہے گا۔ نکٹائی کی گرہ نفاست سے باندھنے کے باوجود رہے گا۔ اپنی ذات سے الگ اور ہونے والا احباب "مہمانوں" حتیٰ کہ رشتہ داروں کے سامنے جیب کی تلاشیں ہر ترتیب و تہذیب سے کاٹ کر پیش کرنے والا انسان۔ وہ انسان پہلے ہے یا شاعر۔ شاعر پہلے ہے یا انسان۔ یا دونوں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے والے ایک دوسرے کو شکست دینے والے۔ کوئی اگر اسے مہذب تک کہہ دے تو کسی کو کھلے گا نہیں۔ اور بلراج کومل کو بالکل نہیں کھلے گا۔ کیونکہ اسے نہ جانے یہ کیوں یقین ہے کہ اچھے انسان اور اچھے شاعروں کی سرحدوں میں تمیز کرنے والے مسخ اوقات کے شکار ہیں۔ بہر طور شاعر کو انسان ضرور ہونا چاہیے۔ چاہے وہ عمر بھر کرائے کے مکان میں رہے۔ صرف مالک مکان کو اس غیر انسانی زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ جو مکان بناتا ہے وہ انسان ہوتا ہے۔

لیکن وہ جس طرح شاعر نہیں لگتا اسی طرح کرایہ دار بھی نہیں لگتا۔ اس نفاست سے وہاں رہ رہا ہے حتیٰ کہ خود اس کا مالک مکان بھی بھول گیا ہے کہ یہ میرا مکان ہے۔ ایک مرتبہ بلراج کومل نے مجھے بتایا کہ میرا مالک مکان

پچھلے دنوں محلے والوں سے پوچھتا پھر رہا تھا۔ "بھائی صاحب! بلراج کول کس مکان میں رہتا ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا "تو ڈکلیئر کر دو کہ میں مکان کا قانونی مالک ہوں۔"

اس پر زیرِ لب سا تبسم، ہلکی سی بے چینی۔ وہ بغل میں پڑی ایک انگریزی شاعری کی کتاب کا جیسے سہارا لیتے ہوئے بولا "ضمیر نہیں مانتا"

سارا فساد اس کے ضمیر کا ہے۔ ضمیر کے خلاف کوئی سا بھی واقعہ اُسے بھڑکا دیتا ہے۔ بغاوت کر دیتا ہے۔ مگر اس بھڑک اور بغاوت میں شور و غل نہیں ہوتا۔ اس کی نظموں میں بھی اقدار کے خلاف ایک بھڑک ہوتی ہے مگر ان میں بھی شور نہیں ہوتا۔ لہجے کی ہمواری نہایت سے جیسے کہہ رہا ہوتا ہے

دل محفل قریب آجاؤ
چند گھڑیاں تو کاٹ لیں مل کر
شاید اس لحظہ صحبت میں
چشمِ نم داستانِ زخمِ دل
ان سے ہو جائے رونقِ محفل

ہاں وہ نشاط کی گھڑیاں اور رونقِ محفل کی پیاس لئے پھرتا ہے۔ کسی سے ملاقات کا ایک لمحہ اس کے لیے نشاط کی گھڑی بن جاتا ہے۔ ضروری سے ضروری کام چھوڑ دیتا ہے۔ کہتا ہے دنیا کا ہر ضروری کام ایک طرح کی روشن ہے۔ اس میں نشاط کہاں۔ نشاط تو اسی میں ہے کہ کسی یار کے ساتھ بیٹھ سکا آملیٹ کھلایا جائے۔ جب ملنے سے شوکی جائے تو اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر نیلنڈ کی کوالٹی کو دوہری جائے آپ اُسے ایک خوبصورت شعر سنا دیں بے ساختہ جملہ کہہ دیں۔ وہ بے اختیار آپ کو گلے سے با قاعدہ چمٹا لے گا۔ ممکن ہے گلے لگ کر آپ کا بوسہ بھی لے لے۔ بوسے پر اکتفا نہ کر سکا تو دعا بھی شروع کر دے گا۔ ہاں اُسے کسی نہ کسی طرح نشاط کا اظہار چاہیے اور آنسو بھی اس کے نشاط کے غماز ہیں۔

وہ خوشی کے چھوٹے چھوٹے لمحوں کا بھکاری ہے۔ ایک بار مجھے کہنے لگا۔ "ظفر صاحب! کل رات دو بجے میری نیند کھل گئی۔ لگا شدید پیاس لبوں پر ہو ید اہوئی تو آنکھ کھل گئی۔

پانی، پانی، پانی۔ پانی کے دو چار گھونٹ، اس وقت مجھے مسرت مہیا کر سکتے ہیں۔ مگر پانی کہاں کہاں رکھا ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا۔

''کاگی (اس کی بیوی) کو جگا دو'' میں نے کہا۔

''ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کسی کی شیریں نیند کو اچاٹ کرنا۔ نہیں تھا۔ نشاط مجھے چاہیے تھی۔ مگر کسی کی شیریں نیند کی بربادی کی قیمت پر نہیں۔ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر کچن کے دروازے تک پہنچ گیا۔ بجلی آف تھی۔

''کیا کچھ سمجھ نہیں آئی''۔

''نہیں مسرت سمجھ نہیں آئی۔'' چنانچہ اندھیرے میں ہی مسرت کا شمع تلاش کرنے لگا۔ اندھیرے میں ہی جگہ جگہ صراحی ٹٹولتا پھرا اور جب صراحی سے لمس ہوا تو مسرت پوچھیا رہو! اضطراب کے لمس بلند کے ساتھ پوری صراحی میرے حلق میں غٹاغٹ اترتی ہوئی اتر گئی۔ کیا مترنم آواز تھی اور کیا ٹھنڈا انشار پانی تھا صراحی کیا تھی بہشت کا روشن دان بھرا تھا نظر آ گیا۔

ہاں وہ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی فنکی خوشیوں کے لئے زندہ رہا ہے۔ ایک چھوٹی سی محفل، ایک چھوٹا سا گھر، ایک چھوٹا سا کیسہ، چھوٹا سا جھگڑا، چھوٹی سی طمانیت۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں اس کی زندگی کو بڑی بڑی مسرتیں دے دیتی ہیں۔ ایک بڑا سا لحمہ غرور اس کے گناہوں سے بھی بڑی عمریں گنوا دیتا ہے۔ رفتارِ حیات کو تیز اور رواں کر دیتا ہے۔ انہی چھوٹی چھوٹی کیفیتوں میں زندہ رہنے کی امنگ ہی کا نتیجہ ہے کہ بلراج کول کے نقوش اور خوشبو میں جو شباب آسا معصومیت اور نکھرا ستھرا پن تھا۔ چونتیس برس بعد آج بھی اس کے سراپا پر لپکتا ہے۔ شاید وہ کبھی بوڑھا نہیں ہو گا۔ اس کا جسم بکھر گیا ہے مگر تازگی اور سپردگی کی نازک اداسی جیسے ازلی ابدی سی لگتی ہے۔ اس کا ٹکا دیا "سیٹو" تو اس کا ماں جایا بھائی لگتا ہے۔

میرا خیال ہے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی کمی اور کوئی جائے پناہ نہیں ملتی اور بلراج کول کو بھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے علاوہ اور کہیں جائے پناہ نہیں ملتی۔ اس لئے دونوں ہر گھڑی ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی موڑ پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔

دونوں میں ہجر و وصال کے ہر کیفیتی سحاط طے ہیں۔

جب بھی بڑی خوشی کا خطرہ ہو۔ وہ ہمیشہ بھاگ جاتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ بڑی خوشی میں تصنع ہے۔ روح غائب ہوتی ہے کہیں کرب خوف رہتا ہے کہ بڑی خوشی کے آتے ہی وہ دو ٹوک جائے گا۔ چھوٹی خوشیاں اُسے جو عمر دکھتی ہیں کہیں کرن میں لیکن دیکھیں نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بن جو عمر ہیں کا تحفہ ہے۔

بڑا ساوضعدار امیروں بڑی کرسی تک وہ پہنچ سکتا تھا۔ نہیں پہنچا۔ کیونکہ نہیں چاہا۔ بڑا منصب کے لئے جدوجہد کر سکتا۔ سکوٹر کے لئے نہیں۔ سکوٹر کے لیے جدوجہد کر سکتا کار کے لیے نہیں۔ یعنی زندگی میں جو چیز جیسی بھی ہے جتنی بھی ہے وہ اسی کو قبول کر سکتا۔ اس میں فرق آ جائے گا اس پر حرف نہیں آئے گا اپنی تو ہین نہیں سمجھے گا۔

وہ پہلے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرتا ہے پھر انہیں سب میں بانٹ دیتا ہے۔ دوستوں میں پڑوس میں رشتے داروں میں آپ اس کے گھر جائیے وہاں ادبی فضا کی خوشیاں بھی ملیں گی اور گھریلو فضا کی بھی۔ دونوں فضائیں اس کی اپنی تخلیق ہیں اور انہی میں وہ مقیم ہے۔

اور انہی چھوٹی چھوٹی کیفیتوں کا ایک ہجوم پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بڑا آدمی بھی بن گیا اور بڑا شاعر بھی۔

☆

"متحرک لمحہ" کو ایک مثال

ڈاکٹر وزیر آغا (مرحوم)

وقت کا تجزیہ کرنے کے لیے اسے تین واضح ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ ہر چند وقت تفریق اور تقسیم سے ماورا ہے لیکن اسے گرفت میں لینے کے لیے تحلیل اور تجزیے کا وہ طریق ضروری ہے جو اسے ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ ان ادوار میں سے ماضی یا مکان محض بیتے ہوئے وقت کی ایک صورت ہے جو وقت کا تشخص پا ہے۔ دوسری طرف مستقبل محض ایک فرضی میدان ہے جس میں وقت ایک رہوار رفتار گھوڑا ہے جو نہ صرف ہر وقت متحرک رہتا ہے بلکہ ایک خاص سمت میں بڑھتا اور ایک نظر پلٹ کر دیکھنے کی کوشش تک نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت تحرک اور تموج کو صرف اسی ایک نقطے پر ہی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے جو "حال" کا لمحہ ہے۔ اگر ہم اس طرح سوچیں کہ وہ ایک مشعل ہے جو آگے ہی آگے کو بڑھتی اور اپنے دائرہ نور کی مدد سے جو دراصل مکان کو تخلیق کرتی ہے تو شاید یہ گہری بات کی کچھ وضاحت کر سکے۔ مستقبل ہر لحظہ اس دائرہ نور میں آ کر مکان کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور دوسرے ہی لمحے ماضی میں داخل کر بے جان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا ممکن ہے کہ کائنات کی تخلیق کا عمل مسلسل اور جاری ہے اور وقت ہی اس کائنات کا خالق ہے۔ نور اس کا وصف خاص ہے شاید اسی لیے خدا نے نور کو نہ صرف اپنی سب سے بڑی خصوصیت قرار دیا ہے بلکہ یہ بھی کہلوایا کہ وقت کو برا نہ کہو کیونکہ میں خود وقت ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ حال کے اس متحرک لمحے سے ہم آہنگ ہوتے ہیں؟ دوسرے لفظوں میں، کتنے لوگ ہیں جو وقت کا روپ دھار کر حال کے اس لمحے کے ساتھ خود بھی متحرک رہتے ہیں؟ بہت کم۔ بات یہ ہے کہ ایک عام انسان یا تو اپنے ماضی میں رہتا ہے یا مستقبل میں۔ اور یہ اس لئے کہ وہ حال کی چندھیا دینے والی روشنی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ محض ماضی یا مستقبل کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں اگر ہم تحجرات (FOSSILS) کا نام دیں تو بجا ہے۔ شاعری میں بالخصوص یہ بات عام ہے اور اسی لئے اس میں حال کے متحرک لمحے کو نہایت کم اہمیت ملی ہے۔ بلراج کومل کو اگرچہ ابھی بہت کچھ تخلیق کرنا ہے اور اس لیے وثوق سے ابھی کچھ کہنا بہت مشکل ہے کہ عمر کے ایک خاص دور میں داخل ہونے کے بعد اس کے رد عمل کی نوعیت کیا ہوگی تاہم جو کچھ اس نے اب تک تخلیق کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں حال کا لمحہ اپنی پوری شدت اور تابانی کے ساتھ ابھرا ہے اور اس نے اس نقطے پر کھڑے ہو کر چاروں طرف ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ یہ نہیں کہ بلراج کومل حال کے اس نقطے پر ٹنگا کھڑا ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ "تابر میش کوش" کے نظریے کا علم بردار بن کر رہ جاتا اور اس کے ہاں اوشی لذائذ اور جسمانی قرب کا احساس "سوچ کی تبدیلی" کو قبول کر دیتا۔ بلراج کومل کی انفرادیت تو اس بات میں ہے کہ "حال" کے اس لمحے میں رہ کر بھی وہ وقت کے سیل رواں سے ہم آہنگ ہے اور اسی لیے متحرک اور زندہ ہے۔ وہ ایک تختے کی طرح وقت کی موج کے رحم و کرم پر بالکل نہیں بلکہ ایک زندہ انسان کی طرح اس تختے کے ساتھ بندھا ہوا آگے کو بڑھ رہا ہے اور اپنی اس حالت کا اسے پورا پورا گیان ہے۔ مثلاً اس کی نظم "عالم کل" کا یہ ٹکڑا دیکھئے

آسمان صدیوں پرانی رہگذر
میں مگر اس رہگذر کے موڑ پر
سنگ خارا کی طرح
وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہوں
دیکھتی آنکھوں سے ہر شے دیکھتا ہوں روز و شب
مضطرب ہوں جانے والوں کیلئے
منتظر ہوں آنے والوں کیلئے

بلراج کومل کے زاویہ نگاہ اور شعری مزاج کو سمجھنے کیلئے "عالم کل" کا یہ ٹکڑا ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ٹکڑے کے مطالعے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاعر وقت کے اس اہم موڑ پر کھڑا ہے جہاں وہ جانے والوں سے بھی احساسی طور پر ہم آہنگ ہے اور آنے والوں سے بھی۔ گویا اس مقام پر وہ شخص ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح جامد اور ساکن نہیں بلکہ اسے دیکھنے کی شکتی بھی حاصل ہے۔ اور اس کی نظر میں وقت کے دونوں ادوار ماضی اور مستقبل کا احاطہ کر رہی ہیں۔ وقت کے آغاز سے انجام تک موجود ہونے کا احساس ایک روحانی تجربے کی حیثیت بھی رکھتا ہے کیونکہ جہاں "لامحدود" سے ہم آہنگ ہونے کا حقیقی طریق یہ ہے کہ اپنی ذات کو اس لامحدود میں ضم کر دیا جائے وہاں مثبت طریق یہ ہے کہ خود کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ ذات اور کائنات میں کوئی فاصلہ ہی باقی نہ رہ جائے۔ بلراج کومل کی اس نظم میں یہ موخر الذکر طریق نہایت نمایاں ہے۔

بلراج کومل نے حال کے اس لمحہ پر سوار ہو کر وقت کے ادوار پر ایک نظر ڈالی ہے تاہم اس کے ہاں وقت کے ساتھ بہتے چلے جانے کا احساس ہمہ وقت تازہ اور توانا رہتا ہے۔

مثلاً یہ چند ٹکڑے دیکھئے

میں آوارہ صدیوں سے
میری روح میں یادوں کی سرمست ہوا
صبحوں کے کنگوروں پہ بکھری ہریالی
شاموں کے چشموں کے کنارے سے ہاتھوں
کے نوری شیشے
نیم شبی کے گھونگھٹ میں چہروں کی دلہن کے قطرے
نیند کی ٹھنڈی گھاس پہ خوابوں کی شبنم
میرے جامِ شکستہ میں
قطرہ قطرہ گرتی ہوئی کائنات کی مے
میرے ساز کی بہکی ہوئی آوازوں نے
اپنی رو میں بہتا ہوں

"نخلستان"

"میں وقت کے کچھ جزیروں میں لپٹا ہوا
سرِ شام آ نکلا ہوں
ریگِ ساحل پہ سیکڑوں سیپیاں ہیں
کھو گئے ہیں

ان کو چنتا ہوں
دامنِ زیست بھر رہا ہوں"

"سمندر"

حیات اپنی منزل کو آج بھی گامزن ہے
میں خاموش

تنہا کھڑا سوچتا ہوں
کوئی دور سے مجھ کو آ کر پکارے

"میں شاعر میں فنکار"

دنوں کی رت میں
بلاؤں میں گھیر تو میں اس سے
قریب سو دنیا رہی ہے
حکایتِ خونچکاں وہی ہے
کہ جدا ہاتھ تھا جدا ہاتھ ہے
کہ جدا سر تھا جدا سر ہے
وہی تگ و دو سفر ہے

"تیرگی"

بلراج کومل کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے جو میں نے بغیر کاوش کے چن لئے ہیں نہ صرف اس مسلسل سفر کی نشاندہی کرتے ہیں جو دراصل وقت کی ایک صفت ہے بلکہ اس بات کا احساس بھی دلاتے ہیں کہ ان نظموں کا شاعر وقت کے چار حصوں یعنی ماضی یا مستقبل میں منقسم نہیں بلکہ وقت کی یلغار میں پیش پیش ہے لیکن چونکہ وقت کے اس نقطے پر بہت کم لوگ بیداری کی حالت میں موجود ہوتے ہیں اس لئے بلراج کومل کے ہاں ایک شدید تنہائی کا احساس بہت نمایاں ہے۔ یوں بھی ارتقائے ذات کے لمحات میں انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے تا آنکہ اس پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس یاترا میں کسی ہمسفر ساتھی کا وجود ہی بے معنی ہے۔ وقت کے اس نقطے پر دوسرا احساس یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر شے رواں دواں ہے۔ تغیر کو ثبات ہے اور اشیاء سے وابستگی بے معنی ہے۔ خود کو بے بال و پر محسوس کرنے کی وجہ جواز بھی یہی ہے۔ وہ لوگ جو محض ماضی کے رسیا ہیں ان کے لیے ماضی سے (جو ان کے لیے ذاتی جاگیر یا اثاثے کی حیثیت رکھتا ہے) دستکش ہونا ممکن ہے اسی لئے تعمیر ہو یا معاشرہ ہمیشہ ماضی پرستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جب کہ خانہ بدوش یا آوارہ قبائل میں ماضی سے منقطع ہونے زمین کو تیاگ کے اور رشتے ناطے توڑ دینے کا احساس ابھر آتا ہے۔ حال کے متحرک سفینے پر سفر کرنے والی روح بیدار چاروں طرف بکھری ہوئی اشیاء سے وابستہ ہونے کے بجائے "ذات" کی پہنائیوں میں غوطہ لگانے اور "جاوداں" ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ بلراج کومل کی نظموں میں اس "لمحۂ بے اماں" یا "بے زماں" میں وقت کی تنگ و دو سے اوپر اٹھ کر جاوداں ہونے کی خواہش بہت نمایاں ہے اور قاری کو سوچنے پر مائل کرتی ہے۔

ماضی کی زنجیروں سے آزاد رہنے کی خواہش بلراج کومل کی کئی ایک نظموں میں ابھر آئی ہے اور میرے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ یہ شاعر FOSSIL POETS کے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مثلاً "نوادرات کی دکان" میں شاعر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ماضی کے نوادر محض کانچ کے بے جان ٹکڑے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گداز جسم زندگی اور حرکت اور جدت کی آماجگاہ ہونے کے باعث ان سے کہیں زیادہ قیمتی ہے اسی طرح "یہ نیا دور" میں شاعر نے ان تمام اصنام کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے جو ماضی کا ورثہ ہیں اور جن سے ہمارے اذہان میں تمدن کی روشنی ہے اور کہا ہے کہ اے پتھروں کو پوجنے والو اپنے چاروں طرف دیکھو وہی عورت وہ آنکھیں وہ کمر کے تل جنہیں تم پتھروں میں دیکھ کر پوجتے ہو زندہ جسموں کی صورت تمہارے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ نظم بھی انجماد، تعمیر اور ماضی پرستی کے مقابلے میں حرکت اور جدت کو نمایاں اہمیت بخشتی ہے۔

حال کے متحرک لمحے کے ساتھ بہتا ہوا شخص نہ صرف ماضی کے بندھنوں کو قبول نہیں کرتا بلکہ ایک خواب پرست کی طرح مستقبل سے بڑی بڑی امیدیں لگانے سے بھی گریز اختیار کرتا ہے۔

اس لیے کہ وہ ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جو روشنی کا نقطہ ہے اور
جہاں سے وہ ماضی کی منجمد فضا اور مستقبل کی سرابی کیفیت کو پوری طرح محسوس کرتا
ہے۔ چنانچہ ایسا شخص حقیقت پسند ہوتا ہے اور احمقوں کی جنت Fools
Paradise میں رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اگر حقیقت پسند ہونے کے
ساتھ ساتھ شاعر بھی ہو تو اگرچہ اس کے ہاں تخیل توانا اور احساس گہرا ہوگا تاہم
حقیقت پسندی کی روش اُسے ماضی یا مستقبل کی تنگنائے میں رکنے کی اجازت
نہیں دے گی۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی
ہے کہ یہ شاعر ماضی میں تحجر کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتا۔ اب اس کی نظموں
سے یہ چند ٹکڑے دیکھیے جو اس بات پر دال ہیں کہ اس شاعر نے مستقبل کے
بارے میں بھی حقیقت پسندانہ نظریے کو اختیار کیا ہے اور اسے اپنے خوابوں،
ارمانوں اور تمناؤں کی آماجگاہ نہیں بنایا

گھروں کی رونق

نوزائیدہ بچے
بکھر جائیں گے شادیانے بجائیں گے۔
آنے والے رنگین دنوں کی خاطر
یہ چند لمحوں کو زندگی کا ماحاصل سمجھیں گے

حسبِ دستور
عمر بھر ان کو نظمیں پڑھا کریں گے

یہ میرا حصہ
یہ تیرا حصہ
پھر ایک دن یہ بھی نوزائیدہ بچوں کے باپ ہوں گے
اور ان کی خاطر دعا کریں گے
وہ خوب ان کی عمریں دیکھیں یہ سو بہاریں

——— ''نوزائیدہ بچے''

ہم مستقبل
کل کی محفل
چھٹی ہونے پر گھر جا کر سوئیں گے
بچے پرانے بستر سے اُٹھ والے رنگیں
خوابوں میں کھو جائیں گے

——— ''طالبِ علم''

میں تم کو حیرت سے دیکھتا ہوں
یہ تیرا جسم زاویوں کی پناہ گہ ہے
تمہارے سر پر
جو سینگ اب تک نہ اُگ سکے تھے
پلک جھپکنے میں یوں اُگے ہیں
کہ جیسے اپنے جنم کے برسوں سے منتظر تھے
لہو کہاں ہے؟
تمہاری رگ رگ میں ایک سیال زہر کا
سحر بیکراں ہے
تمہارے سر پہ آج قرنوں کی داستاں ہے

میں تم کو پہچانتا نہیں ہوں
یہ میرا چہرہ، یہ میری آنکھیں
میں بے زباں ہوں
مگر میں شاید
تمہاری نظروں میں جاوداں ہوں

——— ''میرا بیٹا''

''نوزائیدہ بچے'' میں بلراج کومل نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ
مستقبل محض اس لیے سہانا ہے کہ یہ ابھی تک خوابوں میں لپٹا ہوا ہے ورنہ یہ
حقیقت ہے کہ زندگی تو ایک ڈگر سے ہی چلتی ہے۔ نوزائیدہ بچے جو مستقبل ہیں
اور جن کے ساتھ امیدیں وابستہ کر کے ان کے والدین دراصل مستقبل سے
امیدیں وابستہ کرتے اور خوابوں کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں خود بھی ایک روز
عمر کی پامال راہوں سے گزر کر نوزائیدہ بچوں کے باپ بنیں گے اور اسی طرح
مستقبل کی خوشنما فضا میں زندہ رہنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن شاعر خود ایک
ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے مستقبل کی اس سرابی کیفیت کو بہت اچھی طرح
دیکھ سکتا ہے اسی لئے اس کا ردِ عمل حقیقت پسندانہ ہے۔ دوسری نظم ''میرا بیٹا'' میں
شاعر نے مستقبل کے ایک اور پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ فردوس پرستوں کے لیے ایک لمحہ
فکریہ مہیا کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ مستقبل کا سہانا پن صرف اس وقت تک
ہے جب تک یہ خواب و خیال میں لپٹا ہوا ہے ورنہ جب یہ حقیقت بن کر سامنے
آئے گا تو اس کا اجنبی پن۔۔۔ اس کی بغاوت بالکل واضح ہو جائے گی۔ اس نظم
میں شاعر نے نئی نسل کی بغاوت کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے اور ماضی اور
مستقبل۔۔۔ دادا اور پوتا کے درمیان کھڑے ہو کر ان دونوں حقیقتوں اور ان کے
رابطۂ باہم پر ایک بھرپور نظر ڈالی ہے۔

بلراج کومل وقت کے متحرک، زندہ اور دھڑکتے ہوئے لمحے کا شاعر
ہے اور اسی لئے وہ ماضی یا مستقبل میں رہنے کی بجائے ''حال'' کے لمحے میں رہنا
پسند کرتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا رجحان مادیت یا لذت کوشی
کی طرف ہے۔ وہ ہر گزرتے ہوئے لمحے سے لذت کا آخری قطرہ تک نچوڑ
لینے کی آرزو میں سرشار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آج اور آج سے بھی

زیادہ اس ایک لمحے کو اہمیت دیتا ہے جس کی گرفت میں بھی نہیں
آ سکتی۔ لیکن جو ایک "مسلسل انتظار" ہونے کا باعث بن کر ہمارے سامنے
ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لمحے میں رچے ہوئے بلراج کومل کے ہاں اور پر
رنجے بکھریں اور جاوداں ہو جانے کی آرزو بہت نمایاں ہے۔ یہ بات اُن نظموں
میں خاص طور پر موجود ہے جو "من و تُو" کے رشتے سے متعلق ہیں۔ یعنی جن میں
شاعر اور اس کی محبوب جسمانی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں۔
جسم کے بارے میں بلراج کومل کا رویہ تیاگ اور گریز سے بیگانہ نہیں۔ جسم
اس کے لیے ایک زندہ حقیقت ہے اور جسم سے قربت ایک لذت و انبساط کے
حصول کا باعث ہے لیکن اس کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ اس نے
جسمانی قرب کو بھی رفعتِ ذات کے لیے وسیلہ بنایا ہے کہ زندگی اور اس کے
مظاہر کی طرف اس کا رجحان چمٹنے اور لپٹنے اور رک جانے کا نہیں بلکہ ان مظاہر کو
خود سے لپٹا کر اوپر اُٹھ آنے کا ہے چنانچہ قربِ محبوب کی لذت میں کھو کر بھی اس
کی روح آسودگی اور کیف کی بلند تر سطح کی طرف جست بھرتی ہوئی دکھائی دیتی
ہے۔ یہ چند مثالیں دیکھئے۔

آسماں سے زمیں تک بستی
خواب ہے اور خواب آوارہ
جو سُکاتے ہیں زہر ہوتا نہ
دونوں جسموں میں رشتہ داری ہے
دونوں روحوں پر وجد طاری ہے

___ "وصال"

اگر ہم اس خاکدان بستی میں اپنے زرخیز
گرم جسموں
کو زندگی بھر قبول کر لیں
تو ہم خدا ہوں
ازل سے بہتر
ابد سے بہتر
خدائے ارض و سما سے بہتر
یہ شب حسیں ہے
سحر حسیں ہو گی، دوپہر، شام اور پھر شب
میں آج ہوں اور کل نہ ہوں گا
میں جسم ہوں اب، میں جسم ہوں اب
تو آج ہے اب، تو جسم ہے اب
یہ لمحے بکھریں اب بڑا حسیں ہے
ہمارے جسموں کی وسعتوں میں

وہ موسمِ گل ہے جس کی کوئی خزاں نہیں ہے

___ "موسمِ گل"

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے ان چند سطور میں
بلراج کومل کی نظم نگاری کے ان پہلوؤں سے قطعاً بحث نہیں کی جو مروجہ تنقید کو ہمیشہ
سے بہت عزیز رہے ہیں مثلاً موضوعات و امکانات، ہیئت کے تجربے، طاقتوں اور
برائیوں کے خلاف احتجاج، سماج یا سوسائٹی کی عکاسی، شاعر کا پیغام وغیرہ۔ اور یہ
اس لیے کہ تنقید کی یہ باتیں اتنی بار دہرائی جا چکی ہیں کہ اب پامال شاہراہوں سے
کسی صورت بھی بہتر نہیں ہیں۔ اور ان کے گرد و غبار میں شاعر کی انفرادیت نظر
تک نہیں آتی۔ دوسرے میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں تنقید کے چند امتحانی سوالات کو
سامنے رکھ کر کسی شاعر کے کلام سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ شاعر کے کلام
سے اس کی شخصیت اور روح کی کڑیوں کو ترتیب دینا چاہیے۔ میں نے جب اس
خاص نظریے کے تحت بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کیا تو مجھے ان میں ایک عجیب
سی انفرادیت نظر آئی اور پھر میں نے بلراج کومل کی اس انفرادیت کے چند پہلوؤں
سے بحث کی ہے۔ مزید برآں مجھے یہ کہنا ہے کہ بلراج کومل کی ان نظموں کی اہم
ترین خصوصیت ان کی جہت (DIRECTION) ہے۔ یہ نظمیں نہ صرف خود
متحرک ہیں بلکہ ایک متحرک ذہن کی پیداوار بھی ہیں۔ جن لوگوں نے تاریخی
تہذیب کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کی توثیق کریں گے کہ قدیم سوسائٹی ایک ازلی
و ابدی دائرے میں مقید تھی اور اس لیے وقت کی جہت اور حرکت سے آشنا تک نہیں
تھی۔ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ انسان نے اس قدیم سوسائٹی کی
زنجیروں کو توڑ کر اپنے سفر کا آغاز کیا اور ایک خاص سمت میں بڑھتا چلا گیا اور قافلے
اس سفر کے سنگِ پائے میل تھے۔ گویا انسان کی زندگی میں سفر کا آغاز نے مسائل
تھا پھر سفر محض مادی اور جسمانی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی نوعیت ذہنی اور روحانی بھی
ہوتی ہے۔ گویا جب سوچ کا آغاز ہوا اور انسان نے ہر شے کی ماہیت کو سمجھنے کے
لیے چند اہم سوالات اٹھائے تو وقت سے ہم آہنگ ہو کر ایک لمبے سفر پر روانہ
ہو گیا۔ بلراج کومل کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت مجھے یہی احساس ہوا کہ اس
شاعر نے سوچ کے عنصر کو جگہ دے کر اور ایک خاص سمت میں متحرک ہو کر وقت
کے ازلی و ابدی چکر سے اپنی نظموں کو آشنا کر دیا ہے۔ یہی بلراج کومل کی
نظموں کی اہم ترین خصوصیت ہے کہ ان میں "جہت" یا "سمت" کا احساس
ملتا ہے اور چونکہ یہ جہت یا سمت حال کے لمحے ہی سے واضح ہوتی ہے اس لیے
بلراج کومل نے اس ایک مقام پر کھڑے ہو کر اپنی بیشتر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ سفر
بہت طویل ہے اور راستہ بھی کٹھن ہے مگر بلراج کومل کا جذبۂ بے پایاں اور آرزوئے
سفر اسی طرح جواں و تازہ رہی تو یہ بات غیر اغلب نہیں کہ وہ آگے چل کر اردو نظم
کو ایسی بہت سی منازل سے آشنا کرے گا جو ابھی تک نظروں سے اوجھل ہیں۔
لیکن جن تک رسائی اردو نظم کی توانائی کے لیے از بس ضروری ہے۔"

بلراج کومل کے افسانے

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد، بھارت)

بلراج کومل کے افسانوں میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ ان افسانوں کا تنوع ہے۔ یہ تنوع موضوع کا بھی ہے، تکنیک کا بھی اور اسلوب کا بھی۔ تنوع کی یہ کثرت اگر ایک طرف رنگا رنگی کا احساس پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف افسانہ نگار کی اس کوشش کی بھی غمازی کرتی ہے کہ زندگی کو اس کے واقعات اور مفروضات کو طرح طرح سے دیکھا جائے۔ بلراج کومل کی نظموں میں ایک شائستہ دھیما اور خوش اسلوب آہنگ ملتا ہے۔ یہ آہنگ تمام نظموں میں کم وبیش مشترک ہے۔ اس کے برخلاف افسانوں میں نثر کا آہنگ ہر جگہ ایک جیسا نہیں، کہانی کہنے کا انداز بھی ایک جیسا نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ افسانہ نگار اپنا آہنگ تلاش نہیں کر سکا ہے بلکہ یہ ہے کہ افسانہ نگار کا نقطۂ نظر بدلتا رہا ہے۔ زندگی اس کے سامنے تجربے سے زیادہ مشاہدہ کی شکل میں آتی ہے۔ تجربے کی شکل میں حاصل ہونے والی زندگی میں تجربے سے گزرنے والا شخص اپنے تاثرات اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ سب تجربے ایک شکل میں سے مماثل معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ ایک فطری صورت حال ہے اس سے گریز ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف مشاہدے کی صورت میں حاصل ہونے والی زندگی میں مشاہدات کی بوقلمونی برقرار رہتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ بھی مشاہد کا تابع ہوتا ہے اس معنی میں کہ دیکھنے والا جو کچھ دیکھتا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ہر منظر میں اپنی شخصیت شامل کر دیتا ہے لیکن یہ شخصیت بہر حال دیکھنے والی شخصیت ہوتی ہے تجربے کو انگیز کرنے والی شخصیت نہیں ہوتی۔ ہیوم نے اشیاء کی حقیقت کے معروضی نہ ہونے کا جو حکم لگایا تھا وہ اسی وجہ سے تھا کہ ہر حقیقت ہر دیکھنے والے کو اپنی ہی آنکھوں کے حوالے سے نظر آتی ہے۔ ہیوم سے بہت پہلے غالب اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشاہدہ کی ہوئی حقیقت تجربہ کی ہوئی حقیقت سے زیادہ معروضی ہوتی ہے اس لئے زیادہ متنوع ہوتی ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ جو حقیقت جتنی معروضی نظر آئے گی اتنی ہی سچی بھی ہوگی، لیکن یہ الگ بحث ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ مشاہدہ کرنے والا تجربہ کرنے والے سے زیادہ دیکھتا ہے۔ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ کھیل کے بارے میں تماشائی کو کھلاڑی سے زیادہ علم ہوتا ہے۔

بلراج کومل کے افسانوں کا تنوع اسی نکتے میں مضمر ہے۔ وہ زندگی کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے بیانیہ تکنیک کے کئی طریقے استعمال کیے ہیں۔ ان کے بعض افسانے غائب اور سب کچھ جاننے والے راوی نے بیان کیے ہیں (کنواں، کرچیں، تصویر وغیرہ) تو بعض میں راوی واحد متکلم ہے (تیسرا آدمی، دل یا قوس) بعض میں راوی واحد متکلم ہے لیکن وہ جن واقعات کو بیان کرتا ہے وہ خود ان پر نہیں گزرتے بلکہ وہ دوسروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بیان کرتا ہے (سائے کے ناخن، ایک آدمی کا قتل) کسی زمانے میں راوی غائب تو ہے مگر جو واقعات ہیں وہ محض ایک شخص کے تاثرات اور مشاہدات ہیں (آنکھیں اور پاؤں) کسی میں افسانہ در افسانہ ہے اور دونوں راوی واحد متکلم ہیں (روشنی روشنی) کسی میں راوی بالکل مفقود ہے اس کی جگہ تاثرات اور حافظے میں منتشر یادوں اور گزشتہ آئندہ واقعات کی طرف علامتی اشاروں نے لے لی ہے (جنبی گڑیا، پری کی رات) جن افسانوں میں واحد متکلم راوی کا کردار کچھ اہمیت رکھتا ہے ان میں بھی اس کی حیثیت مرکزی نہیں بلکہ مشاہدے کی ہے (تیسرا آدمی) لیکن بعض افسانوں میں مشاہدے کی شخصیت نمایاں ہونے کے باوجود خود سوزی رنگ بھی موجود ہے (قلم کے ٹکڑے، بجلی) یہ سب افسانے ایک پائے کے نہیں ہیں لیکن فی الحال صرف اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ ان افسانوں میں بیانیہ کے مختلف طریقے کم و بیش کامیابی کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کو پڑھتے وقت اس قسم کی تکرار کا احساس نہیں ہوتا جو ہمارے زمانے کے بعض بہت اچھے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر افسانے ایک ہی کردار یا ایک ہی شخص کے تاثرات پر مبنی ہیں لیکن راوی کے تنوع کی وجہ سے اس بات کا احساس ناگواری کی حد تک نہیں پہنچتا۔

موضوع کے اعتبار سے دیکھئے تو تمام افسانوں میں معاصر دنیا بیان کی گئی ہے لیکن بعض میں انسانوں کی بے حسی وہ نچلے متوسط طبقے سے ترقی کرکے متوسط طبقے تک پہنچنے والی کی کیفیت اور اخلاقی دیوالیہ پن کا ذکر ہے (تیسرا آدمی، کرچیں) کسی میں روزمرہ زندگی میں تشدد اور اس تشدد کے روبرو عام لوگوں کی بے بسی کا ذکر کیا گیا ہے (ایک آدمی کا قتل) بعض میں دانشوروں کے لایعنی اور کھوکھلے پن پر طنز ہے (قلم کے ٹکڑے، روشنی روشنی، بجلی) بعض میں ہمارے زمانے میں احتجاج برائے احتجاج اور ریاکاری اور تشدد پسندی اور بے حسی کی شدت پر افسوس اور برہمی اور طنز ہے (آنکھیں اور پاؤں، دل یا قوس) کسی میں پوری زندگی کی بے معنویت کو موضوع بنایا گیا ہے تو کسی میں زندگی کے غیر متوقع طور پر بھیانک ہو جانے کا ذکر ہے (سائے کے ناخن، کنواں اور تصویر) میں اسرار کی کیفیت نمایاں ہے۔ زندگی عجیب بھی ہے اور پر اسرار بھی بلکہ بڑی حد تک ABSURD بھی ہے کیونکہ "تصویر" کے دو کرداروں میں سے ایک غریبی سے گزر کر کامیاب بزنس مین کی منزل پر پہنچ چکا ہے اور اپنے ماضی سے آزاد ہوا

چاہتا ہے لیکن آزاد نہیں ہو سکتا۔ دوسرا بھی غریب ہے اور کامیاب بزنس مین بننا چاہتا ہے لیکن دونوں اپنی شخصیت اور وجود سے بے خبر بھی ہیں اور اس کے بارے میں عجیب و غریب تاثرات بھی رکھتے ہیں چنانچہ دونوں ایک تصویر کو اپنی تصویر سمجھتے ہیں۔ لیکن دراصل وہ کسی پرانے کیلنڈر سے کاٹی ہوئی مجہول تصویر ہے۔ اس طرح دونوں کی شخصیت اور وجود ایک طرف تو فرضی اور اشتہاری اور مصنوعی نظر آتے ہیں تو دوسری طرف پر اسرار اور ناقابل فہم معلوم ہوتے ہیں۔

اسرار کی یہ کیفیت "کنواں" میں اور زیادہ نمایاں ہے۔ افسانہ جس واقعے کو فوکس میں رکھ کر پیش کیا ہے وہ خود ناقابل فہم ہے۔ جب شہر میں جگہ جگہ پانی کے نل لگ گئے تو کنویں بیکار ہو گئے پھر ایک شخص نے کنویں پھلانگنے کا مشغلہ تقریباً اختیار کیا اور آہستہ آہستہ اس فن میں طاق اور شہرہ آفاق ہو گیا۔ افسانہ غائب راوی کی زبان سے بیان کیا گیا ہے۔ اگر راوی واحد متکلم ہوتا تو ممکن ہے ہمیں گمان گزرتا کہ واحد متکلم ہمیں بیوقوف بنا رہا ہے یا کوئی اہم بات کہہ رہا ہے۔ راوی کے غائب ہونے کی وجہ سے ہمیں اس بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ بات کچھ ایسی ناقابل یقین بھی نہیں، ناقابل فہم ضرور ہے۔ ہم سوچتے ہیں آگے چل کر بات صاف ہو گی لیکن تھوڑی ہی دیر میں بات اور الجھ جاتی ہے کیونکہ کنواں پھلانگنے والا مشق اور ٹریننگ کی غرض سے (کیونکہ اسے مقابلے میں حصہ لینا ہے) کنووں کی تلاش میں نکلا ہے۔ ایک کنواں جو اس کی مشق کیلئے بہت مناسب ہے ایک سوکھے سڑے شخص کی آماجگاہ ہے جو تمام دنیا سے بیزار ہے۔ اسے سب لوگوں نے اپنے جبر اور تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اس کنویں پر خودکشی کیلئے آیا ہے۔ دونوں میں فلسفیانہ قسم کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ آخرکار کنواں پھلانگنے والا سوکھے سڑے شخص کو اس بات پر راضی کر لیتا ہے کہ پہلے وہ کنواں پھلانگ لے پھر خودکشی کرنے والا خودکشی کرے۔ لیکن کنواں پھلانگنے والے کی پر زور جست ناکام رہتی ہے۔ وہ کنویں میں گر جاتا ہے اور خودکشی کرنے والا وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔

افسانہ ہمارے سامنے کئی سوال کھڑے کرتا ہے لیکن تشفی بخش جواب نہیں ملتے، کنواں پھلانگنے والا زندگی کا پرستار، رجائی اور مثبت فکر کا مالک ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک مقابلہ، ایک مسابقتی عمل ہے۔ خودکشی کرنے والا ہر چیز سے بیزار ہے اسے کسی پر اعتبار و اعتماد نہیں۔ کنواں پھلانگنے والا زندگی پر اصرار کرتا ہے تو خودکشی کرنے والا مرنے پر تلا ہے۔ لیکن موت کنواں پھلانگنے والے کی واقع ہوتی ہے خودکشی کرنے والا بھاگ لیتا ہے۔ کیا زندگی اس طرح کے غیر متوقع، طربیہ المیوں کا نام ہے؟ کیا وہ خودکشی کرنے والا، کنواں پھلانگنے والے کی موت کا فرشتہ اور پیامبر تھا اور جان بوجھ کر اسی کام پر متعین ہوا تھا؟ اگر ہاں تو اس کو متعین کرنے والا کون تھا؟ کیا خودکشی کرنے والے کا فرار اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو بھی جو موت سے عشق اور زندگی سے نفرت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ کیا کنواں پھلانگنے کے عمل میں کوئی تمثیلی اشارہ پنہاں ہے؟ اگر ہاں تو کیا وہ اشارہ یہ ہے کہ کنواں پھلانگنے سے مراد Ambition ہے اور زندگی ایک پل صراط کی طرح ہے اور جن لوگوں میں Ambition ضرورت سے زیادہ ہے وہ اس پل سے گزر کر نیچے گہرے کنویں میں غرق ہو جائیں گے۔

سوالات کی اس کثرت اور ممکن جوابوں کی فراوانی کی بنا پر یہ افسانہ کافکا کی یاد دلاتا ہے۔ اس اور بعض دوسرے افسانوں میں راوی کا لب و لہجہ بے حد عاری اور بڑی حد تک خشک اور غیر ڈرامائی ہے۔ یہ لہجہ افسانے میں بیان کردہ واقعات کے انوکھے پن کو نمایاں کرتا ہے۔ جہاں جہاں بلراج کومل نے کرداروں کے جذبات اور تاثرات کو براہ راست بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہاں استعجابیت کم ہو جاتی ہے لیکن اپنے بہتر لمحوں میں وہ اپنے خشک اور غیر جذباتی لہجے کو واقعات کے مقابلے میں ایک CONTRAST کے طور پر پیش کرنے اور اس طرح اسرار کے تاثر کو شدید کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

جب میونسپل کارپوریشن کی طرف سے شہر کے بیشتر حصوں میں پانی کے نل مہیا کر دیے گئے تو شہر کے اکثر کنویں بے مصرف ہو گئے اور کافی عرصے تک بے مصرف رہے۔ آخر ایک ذہین شہری نے ان کا ایک انوکھا مصرف ڈھونڈ نکالا۔ اس نے ایک جست میں کنواں پھلانگنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ اس کے بعد اس ذہین شہری نے کنواں پھلانگنے کا شغل باقاعدہ اختیار کر لیا

(کنواں)

کمرے کی دھندلی روشنی میں اس نے آئینے کی سطح کا جائزہ لیا۔ آئینے پر بہت سی خراشیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ کئی جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ عقب میں لگے ہوئے ایک پرانے کیلنڈر کا عکس آئینے میں دکھائی دے رہا تھا۔ خراشوں کی ایک دوسرے کو بے تکی سے کاٹتی ہوئی لکیروں میں اسے اپنا چہرہ ایک ایسی تصویر کی طرح نظر آیا جو کاغذ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی، اور جس میں ان لکیروں کو نمایاں کر دیا گیا تھا جہاں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

(تصویر)

اس کے برخلاف "جھمی گڑیا پری کی رات" میں سپاٹ بیانیہ کو مسترد کر کے واقعات کی منطقی ترتیب کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ترتیب کی جگہ حال اور ماضی کا ادغام ہے تو مستقبل کی بھی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔ پیکروں اور تشبیہاتی الفاظ کی کثرت ہے۔ اس طرح افسانے کا آہنگ نثری نظم کے آہنگ سے مل جاتا ہے۔ افسانے کی ابتدا ہی ایک نثری نظم سے ہوتی ہے جو پورے افسانے کی کلید معلوم ہوتی ہے۔

شبنم جھمی گڑیا پری

آج پھر اس نے رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں اور تتلیوں کا خواب دیکھا آج پھر وہ
اس وادی میں اتری جہاں ایک روشن ستارے نے اسے کئی برس پہلے
اتارا تھا آج پھر وہ اس ندی کے کنارے دیر تک بیٹھی جہاں ایک شہزادہ گھوڑے
پر سوار اس سے ملنے آیا تھا لیکن یہ سب صرف ایک لمحے کے لیے ہوا اس کی
آنکھ کھل گئی تھی اور وہ درد و کرب سے ماورا ہلکی ہو گئی تھی۔

یہ افسانہ ہمارے سامنے نام نہاد ترقی یافتہ روشن خیال سماج میں عورت
کے استحصال کے خلاف زبردست احتجاج ہے لیکن شعریت کی کثرت نے
اسے پوری طرح افسانہ بننے نہیں دیا۔ طارق کوثر کا وہ اسلوب جہاں وہ شاید
غیر متعلق راوی کی شخصیت میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے افسانوں کیلئے
زیادہ موزوں ہیں۔

لیکن یہ خاموش شاید غیر متعلق راوی بے حس نہیں ہے وہ جذبہ ہے جو
انہیں افسانہ کہنے پر مجبور کرتا ہے ہمدردی، کرب یا بے بسی کا جذبہ ہے یہ بے بسی کا
نشانہ وہ عقل اور تہذیب سے عاری لوگ بھی ہیں جن کے دلوں سے ہمدردی کا
جذبہ ختم ہو چکا ہے جو ایک پاگل کتے کے گھر سے نکالے جانے اور اس کے گولی کا
نشانہ بننے کا منظر تماشے کے طور پر دیکھتے ہیں اور یہ پوری زندگی بھی ہے جس میں
تشدد اور غیر متوقع تصادم اور بے وجہ حادثات کی کثرت ہے جس میں گھر سے
بھاگ کے وہ لڑکا ایک بار تو سیر سپاٹا کر کے خوش و خرم واپس آتا ہے لیکن دوسری بار
کسی قاتل کا شکار ہو جاتا ہے۔

دہشت زدہ جانوروں میں ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے جو انہیں
مطلع کر دیتی ہے کہ ان کی موت قریب ہے۔ بدکا ہوا ہوا جب گلی سے آخر تک
پہنچ گیا تو بھیڑ نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ واپس مڑا اور دوسرے سرے سے چلا
ہوا گلی کے دوسرے سرے تک پہنچ گیا۔ یہاں ہجوم کی دوسری ٹکڑی نے اس کا
راستہ روک لیا۔ وہ پھر واپس مڑا۔ اس بار تھک سے اس نے گلی کے چار پانچ چکر
کاٹے اور پھر اس موڑ کی لکیر کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔

(تیسرا رُخ)

نشانہ چوک گیا۔ گولی سنسناتی ہوئی ریکو کے کان کے قریب سے
گذر کر ملبے کے ایک ڈھیر میں گھس گئی۔ ہجوم میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔

(تیسرا رُخ)

ذہنی میرے ذہن سے اتر گیا۔ ہو گا کوئی گھر سے بھاگا ہوا لڑکا!
میرے بچے میرے گھر میں محفوظ تھے۔ صبح ہوئی معمول کے مطابق بچے سکول کے
چلتے ہوئے بیدار ہوئے معمول کے مطابق ــــ میں نے چائے کا پیالہ اٹھایا
اور اخبار کھولا ــــ ایک بچے کے قتل کی خبر عمر ۱۲ سال ــــ رنگ ــــ
میرے ذہن میں ایک انجانا سا ایک خیال کھد سے کسی طرح چکا۔

(سائے کی لاش)

ذہنی جب پہلی بار بھاگا تو لوگوں نے اس کے والدین سے بے حد
ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ جب وہ محفوظ اور خیریت سے واپس آ گیا تو لوگوں کو ایک
طرح کی ناراضگی اور جھنجھلاہٹ ہوئی۔ چنانچہ جب وہ دوسری بار بھاگا تو طرح
طرح کی افواہیں باتیں کی گئیں۔ فیصلہ کیا گیا اب کی بار ذہنی واپس آیا تو اپنے
بچوں کو اس کے ساتھ کھیلنے سے روکیں گے لیکن اس بار ذہنی واپس نہیں لوٹا۔
اس کی لاش بھی سالم نہیں تھی زندگی میں اس طرح کا تشدد
Prabability کی کمی اور غیر منطقی بے معنویت طارق کوثر کی بے بسی اور رنج
دونوں کو متحرک کرتے ہیں۔

زمین سے آسمان تک ایک بھیانک شعلہ لپلپا رہا تھا جو اپنی خونیں
زبان سے عمارت کا گوشت چاٹ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے تجزیے سے دھندلے
ہوتے ہوئے افق پر ایک پل کے لئے اس کے معصوم بچوں کے معصوم چہرے
نمودار ہوئے۔ ایک اجنبی شور اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ مگر اس کے بعد ایک گہری
تاریکی اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں اتر گئی۔ (آنکھیں اور پاؤں)

اس طرح ستیا رتھی جو اپنے بچوں کے لیے کاپی کتابیں خریدنے نکلا
تھا ایک جلوس کے بے قابو وحشیانہ سیلاب میں پھنس کر اس تشدد کا شکار ہو گیا۔ جو
اس جلوس نے برپا کیا تھا اور پھر جس کو ختم کرنے کیلئے پولیس نے جلوس اور
تماشائیوں پر توڑا تھا۔ جو لوگ اپنے گھروں میں بند تھے وہ آگ کا شکار ہوئے
اور جو لوگ سڑک پر تھے وہ گولیوں کے یا اندھادھند کے حادثات اور ہلاکتوں کا شکار ہوئے۔
نیلم بھی اسی طرح سایہ کا زل گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس سے بھاگ
کر پہاڑ کے خوبصورت مقام میں پناہ لیتا ہے وہاں اسے اپنے ہوٹل کے پیچھے
پانی کے گرنے کی آواز سنائی دیتی ہے وہ اسے آبشار سمجھتا ہے اور رات بھر اس
کے تصور میں گم رہتا ہے کہ صبح کو آبشار کی سیر کریں گے۔ صبح کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ
آبشار نہیں بلکہ ہوٹل کے گٹر سے پانی کا اخراج ہے جو صنعتی ہر جگہ ہے جس صورتی
سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ گندگی اور غلاظت ہر جگہ ہے خود تمہارے اندر ہے
تمہارے گرد و پیش میں ہے۔ شاید افسانہ اس قسم کے کسی اخلاقی سبق کا اظہار نہیں
کرتا، بلکہ جو الجھن بنا شاہ جیسے نازک مزاج لوگوں سے ہمدردانہ طور پر لہجے میں
کہتا ہے کہ تمہارا دور ختم ہو گیا اب جدید صنعتی دور ہے یہ کثافت اور گندگی سے
گندہ پانی بہتا ہے۔ شاید اس افسانے کا ماحصل یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ
نفاست اور نازک مزاجی اور اصل حقیقت سے فرار ہے۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانے نہایت سادہ رنگ میں اس طرح
کی گئی پیچیدہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو قاری کو زندگی اور انسان اور خود اپنے بارے
میں طرح طرح کے شکوک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ میں اسے طارق کوثر کی بہت
بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔

☆

ادب کی تلاش

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی بھارت)

بلراج کومل شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں اور نقاد ہیں۔ شاعری میں اب تک ان کے پانچ مجموعے میری نظمیں، رشتۂ دل، سفر مدام، سمندر ہم سے دور اور پرندوں بھرا آسمان شائع ہو چکے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کی شاعری کا انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "آنکھیں اور پاؤں" اور ہندی میں ایک ناولٹ "ہریالی کا ایک ٹکڑا" شائع ہو چکا ہے۔ یہ تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ بلراج کومل شاعر، افسانہ نگار اور نقاد ہیں لیکن ان کی شخصیت کا بھرپور وسعتوں کے ساتھ شاعری اور شاعری میں نظم میں اظہار ہوا ہے۔ افسانوں کی شخصیت و کردار پر کچھ اور روشنی پڑتی ہے۔ بلراج کومل کے تنقیدی مضامین اور تبصرے ان کی فکر و نظر یہ ان کی ادبی قدروں کو نئے صاف اور واضح انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان کی روشنی میں بلراج کے تخلیقی کارناموں کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ بلراج کی تخلیق میں انسان اور اس کے مسائل کے ساتھ ایک گہرا اور مسلسل تعلق بھی نظر آتا ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں گہرا تنقیدی شعور اور ایک فکری نظام نظر آتا ہے۔ اردو میں تنقید اور تخلیق، ادبی سرگرمیوں کے دو الگ الگ شعبے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی نقاد نے اعلیٰ درجے کا تخلیقی ادب پیش کیا یا کسی تخلیقی فنکار نے اعلیٰ درجے کی تنقیدی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ بلراج کومل ان بہت کم تخلیق کاروں میں ہیں جو تنقید کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے اردو اور انگریزی کے تنقیدی ادب کا گہرا مطالعہ کر کے زندگی، ادب، فن اور سماج کے بارے میں اپنی رائے قائم کی ہے اور جن کی تحریروں میں ہر چیز کے بارے میں سوچی سمجھی رائے ملتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۵۰ء تک کے اردو کے بہترین تخلیقی اور تنقیدی ادب کا انتخاب کیا جائے تو اس ادب میں اکثریت ان ادیبوں کی ہوگی جن کے خالق اصل معنی یا اصلاحی معنی میں ترقی پسند تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض ترقی پسند ادیبوں کا ذاتی کردار کچھ بھی رہا ہو ان کا ایک مقصد، ایک نصب العین، ایک سمت اور منزل تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں آزادی اہم ترین واقعہ تھا لیکن ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ واقعہ خاصا پریشان کن تھا۔ ان کے سامنے کوئی منزل اور کوئی مقصد نہیں رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بقول بلراج کومل ادب کی مثبت قدروں اور زندگی کی معنویت کو فنا دینے کے بجائے لفظوں کی ترتیب اور اشکال کو شاعری سمجھا جانے لگا۔ ان مسائل کو موضوع بنایا گیا جو ہمارے مسائل ہی نہیں تھے۔ تنہائی، بے چہرگی اور ذات کے کرب کے نام پر زندگی کی بے معنویت اور بے مقصدیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور بلراج کومل کے قول کے مطابق لفظ اور معنی اپنا توازن کھو بیٹھے۔ "ادب کی تلاش" میں شروع میں دو مضامین ہیں "ادب کی تلاش" اور "جدید ادب"۔ ان دونوں میں ۱۹۵۰ء کے بعد پیدا ہونے والے اردو ادب کے حوالے سے تنقیدی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ادب، ادیب، صاحب اقتدار طبقہ، پیشہ، سماجی وقار، آسائش کے سامان، شہرت وغیرہ کے باہمی رشتوں پر انتہائی عالمانہ اور غیر جانبدارانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بلراج کومل نے اصل ترقی پسند اور اصلاحی ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں بڑی معقول تفریق کی ہے۔ انہوں نے ان ادبی رویوں اور مظاہر کی نشاندہی کی ہے جو اصلاحی ترقی پسندوں سے متعلق ہے۔ بلراج کومل کے پہلے مقالے "ادب کی تلاش" کا ایک پیراگراف نقل کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس پیراگراف میں ادب کے سلسلے میں بہت اہم اور بنیادی باتیں کہی ہیں۔

"ادیب و فنکار کا حقیقی مرتبہ ادب اور فن کے معیار اور قدروں سے متعین ہوتا ہے۔ وہ شخص جو صاحب اقتدار طبقے کی قدر و منزلت کو قبول نہیں کرتا، کسی سماجی مرتبے کا مالک نہیں ہوتا لیکن جب انکار کا عمل اثر اندازی کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ شخص پہلے توجہ کا مرکز بنتا ہے پھر ایک حلقہ اثر کا مرکز اور آخر کار دوسرے ہم خیال لوگوں کی مدد سے ایک تحریک کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ فرد یا افراد ایک نئی قدروں کو جنم دیتے ہیں۔ جو ایک مخصوص سماج کی مروجہ اقدار سے مختلف ہوتی ہے۔ جب یہ عمل اپنی انتہا پر پہنچ کر اپنا تحریک کو پہنچتا ہے تو انکار اور بغاوت کا رخ ایک بار پھر بدل جاتا ہے۔ ادب کی پوری تاریخ انکار اور بغاوت کی تاریخ ہے۔ ادب کی پوری تاریخ میں ہمارے عظیم ترین کردار وہ ہیں جو انکار و بغاوت کی علامت کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں چاہے وہ کردار دوستووسکی کے ہوں یا ترگنیف کے یا پریم چند کے"

زیر نظر کتاب کا دوسرا اہم مضمون "جدید ادب ایک رویّہ" ہے۔ اس مضمون میں جدید فنکاروں کے تخلیقی رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے میں شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نیم مستقیم کی شاعری اور نیم دیوانگی کی شاعری۔ بہت معقول طریقے سے ان دونوں قسموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

بلراج کومل کے قول کے مطابق انشاء، غالب اور عباس اطہر کی شاعری دیوانگی کی شاعری ہے۔ اس سلسلے میں عباس اطہر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بلراج کومل صاحب لکھتے ہیں۔

"عباس اطہر کے یہاں الفاظ میں ایک پر اثر اور شدید تحریک ہے۔ الفاظ اور مصرعے ٹکڑے ٹکڑے اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر چونکا دینے والی قوت ہے۔ ایک عجیب و غریب دیوانگی، پوری نظم کا مفہوم آسانی سے مرتب نہیں ہوتا لیکن نظم اپنی قوت کا احساس دلاتی ہے"۔ اپنے اس بیان کی تائید میں بلراج صاحب نے عباس

نقشِ گریزار

جناب بلراج کومل کے کلام سے مختصر انتخاب

فاری شا (کمرہ)

تکمیل

جب موسم کی پہلی بارش چھم چھم کرتی آئی تھی
میں نے تمہیں
گھر کے ہر گوشے میں ڈھونڈا لیکن تم
کہیں نہ تھیں
میں موسم کے جادو میں
کھویا ہوا
کمرے کی کھڑکی کے شیشے سے چپکا
رنگ و نغمہ کی سرشاری اپنے جسم و جاں میں کوشش بھر
جذب تو کرتا جاتا تھا
لیکن تم اس ساعت میں
چونکہ میرے ساتھ نہیں تھیں موسم کا یہ جشن مجھے
آدھا اور ادھورا سا
لگنے لگا

تکمیل کے عالم میں جب کھڑکی کے شیشے سے
میں نے تمہیں
مرے پلنگ پہ اک رقصاں تصویر کی صورت بارش کی وارفتہ
موجوں میں ڈھلتے دیکھا
میں بھی فقط
ایک جست میں سب دیواریں پھاند گیا
سارے سلاسل سے آزاد
جا پہنچا دیوانہ وار تمہارے پاس
موسم کے بے پایاں جشن میں ساری حدوں کے آر اور پار

پارہ پارہ ایک کتاب

باقیات خانۂ دل میں جواہر اب کہاں
اور اس کنجِ قفس میں جس کا میں مہمان ہوں
چار سو بکھرا ہوا تھا میرے بچھڑے ہم رفیقوں کے لہو میں سے اجڑا ہوا
کھو گیا تھا آج میں دشتِ منظر میں کہیں

وہ جو آیا تھا مجھے
سارے متروکات سے آزاد کرنے اس نے ہاتھوں سے سمیٹا سب کباڑ
اور ایک گٹھڑے میں باندھا
جب وہ اس کو
سر پہ رکھ کر
پاس کے اپنے ٹھکانے کی طرف چلنے کو تھا
میں نے دیکھا اجڑی بچھڑی پارہ پارہ اک کتاب
حیرت و حسرت کی مورت
اس کے گٹھڑے کی کسی نادان کھڑکی سے
مری جانب مسلسل دیکھتی جاتی تھی
جیسے کہہ رہی ہو
میں تو صدیوں سے رہی تھی
آپ کی ہم راز و دیرینہ رفیق
آپ نے یہ کیا کیا
مجھ کو رخصت کر دیا۔
میرے اندر جاگ اٹھی بے نام قوت کوئی
آگے بڑھ کر کو نوچا لی ہے میں نے گٹھڑے سے پرانی پارہ پارہ وہ کتاب
اس کو آنکھوں سے لگاتا ہوں اسے میں چومتا ہوں آنسوؤں کے درمیاں
پڑھ رہا ہوں آج پھر اس کو یہ ممکن ہے کہیں اوراقِ پارینہ میں ہو
گمشدگی میں قائم و دائم کوئی ان جانا خواب
یا حیات و مرگ کے اسرار کا
بھولا بسرا یا کوئی تازہ جواب۔

اداکار

جان کاؤس ہونا ڈیا
میری تازہ فلم میں وہ
میری عرضی پہ رول ادا کرنے کی خاطر
بھولے بسرے جادو بھرے
کسی دیس سے آئے ہیں
کتا، گھوڑا اور بچہ۔
میری فلم کے باقی کے
عام سے سب کردار مگر
غائب ہیں
وقت ہو چلا لیکن ان کی خبر نہیں
ملتوی کر دوں آج کی شوٹنگ
یا پھر میں
سوچتا ہوں
میں جو اکثر سب کی کایا کی پرتوں سے گزرا ہوں
محض تماشائی پن سے آگے نکلوں
ایک اکیلا میں ہی اپنا رنگ بدل کر
روپ بدل کر
اپنے رول کے ساتھ ساتھ ان کا بھی رول نبھا ڈالوں
اور اپنی
آخری فلم
کسی طرح
آج مکمل کر ڈالوں

لہلہاتا پیڑ

ایوانِ روز و شب میں جب داخل ہوا تھا میں
لایا تھا اپنے ساتھ میں تازہ جہاں
اشیائے نو بہ نو کی تھی فہرست بڑی طویل
لمبے سفر کے فیض سے مجھ کو ملا تھا تحفہ و انعام بھی کئی
رشتوں کے جشن، چاہتیں، خوشیاں ہزار ہا
لیکن کبھی کبھی
کچھ ایسے فاصلے
بے برگ و بار فاصلے بھی قربتوں کے درمیاں حائل ہوئے
تو مجھ کو یوں لگا
میرے کسی گناہ کی مجھ کو سزا ملی
میں نے مگر بنا لیے رفتہ رفتہ ان پہ پل کئی
جن کے طفیل آج بھی میں گامزن ہوں زندگی کی راہ گزر پہ
لہلہاتے پیڑ کی طرح
میں جاوداں نہیں
لیکن میں وصلِ آب و گِل کا شاہکار ہوں
میں اپنے لامکاں کا راہوار ہوں

کاغذ کی ناؤ

رات کو سونے سے پہلے
مجھ سے ننھا کہہ رہا تھا چاند لاکھوں میل کیوں کر دُور ہے
کیوں چمکتے ہیں ستارے ـــــ وہ غبارے کالی بلی کیا ہوئی؟
میرے ہاتھی کو پلاؤ گرم پانی مجھ کو نیند آنے لگی

نصف شب کو آتے جاتے بادلوں کے درمیاں
کچھ حروفِ ناتواں
بوندیوں کے روپ میں کاغذ کے اک پرزے پہ میرے ساتھ
دیر تک گرتے رہے
قلم کے نقش گریزاں نے ستم لاکھوں سہے
ان گنت برسوں پہ پھیلی چشم و دل کی داستاں
رات کے پچھلے پہر کی گود میں
تیز تر ہوتی ہوئی بارش کی لوری سن کے شاید سو گئی

صبح دم
کھل اٹھے چاروں طرف بچوں کے رنگیں قہقہوں اور
تالیوں کے سرخ پھول
رات بھر کی تیز بارش کی بنائی جھیل میں
ڈگمگاتی ڈولتی
چل رہی تھیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں
میں نے دیکھا ان میں ننھے کی بھی تھی پیاری سی ناؤ
قلم کا نقش گریزاں نیا نیا پہچانا سا کاغذ جانے کہاں نے حروف
ننھا بولا: آج جتا لی نہ پیچے بیوقوف!

ڈرگ سٹور

اگر میں جسم ہوں تو سر سے پاؤں تک میں جسم ہوں
اگر میں رُوح ہوں تو پھر تمام تر میں رُوح ہوں
خدا سے میرا سلسلہ وہی ہے جو صبا کا ہے
اگر میں سبزہ ہوں
تو روح اور جسم کی
وہ کون سی حدیں ہیں فاصلوں میں جو بدل گئیں؟
زمین میری کون ہے؟
چمکتا نیلگوں حسین آسمان کون ہے؟
جو رنگ و گل میں دھیرے دھیرے جذب ہو رہی ہے
دھوپ زرد دھوپ کیوں مجھے عزیز
میں سوچتا ہوں سب مگر میں طاقچوں میں بند ہوں
میں نام کوئی ڈھونڈتا ہوں آج اپنے کرب کا
تلاش کر رہا ہوں ایک ایک پل
قطار در قطار شیشیوں کے اس ہجوم میں
وہ آسمان کیا ہوا؟ وہ سبزہ کیا ہوا؟
جگر میں آگ تھی مگر جگر برف بن گیا
جو سرخ تھا بھی سرالہو سپید ہو گیا
میں بوٹیوں میں کٹ گیا
میں دو ٹکڑوں میں بٹ گیا
یہاں پہ میری روشنی یہاں پہ میری زندگی
سپید، سرخ، زرد، نیلگوں، سیاہ لیبلوں میں بٹ گئی
صبا کی رہگزر سے دور ہٹ گئی

ماں

میری ماں کی
خمیدہ پشت پر
جو بوجھ تھا
وہ میرے دن کے ڈھلتے ہی
مسلسل بڑھتا جاتا ہے
جو بچّے اس نے اپنی کوکھ سے جنے
مرے بھائی بہن اور سب مرے اپنے
وہ لاکھوں اور کروڑوں میں
حدِ آفاق تک
پھیلے ہوئے ہیں چار سو
اور دور تک لڑتے ہوئے
صدیوں کے اپنے ہی گندے آلودہ ملبے کی
ہزاروں گٹھریاں
اس خم جاں پر
لادتے جاتے ہیں ہاتھوں سے
بیاں بے سوچتے ہیں
میرے سب دُکھ کے لے جائے گی آخر تک

بیاں
کچھ اس قدر بار گراں سے جھک گئی ہے اب
یہ خدشہ ہے
فاصلہ اور اس کے بوڑھے خمیدہ جسم کا
باقی ماندہ کا فاصلہ اک روز شاید ختم ہو جائے
مگر ماں ہے
کہ وہ اپنے سفر کے راستے پر
آج بھی رکتی نہیں ہے
بے خبری
خامشی سے
ہر تھکن سے ماورا
معمول کی رفتار سے
چلتی ہی جاتی ہے۔

بھان متی کا کنبہ

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا
بھان متی نے
صدیوں کی کوشش سے جو کنبہ تھا جوڑا
دور دور تک
کنکر کنکر بکھر گیا ہے
بھان متی کے اپنے ہاتھوں پالے گورے کالے بچے
چوپائے دوپائے زاجنڈ تک مسافر
بھوک کے پیاسے
اک بستی سے دوسری بستی کی جانب پیاس لگائے
آگے پیچھے بھاگ رہے ہیں
پانی کے دو قطرے گندم کے دو دانے
شاید ان کو مل جائیں گے
ملبے کا ایک پربت جیسا ڈھیر پھیلتا جاتا ہے دن رات یہاں
بھان متی کنگال دیس کی نر دھن رانی
بیٹھی ہے اس پربت کی اونچی چوٹی پر
میلا چیکٹ
دھول بھرا اک تاج ہے اس کے گنجے سر پر
نابینا آنکھوں سے اس کی
گنگا جمنا بہتے بہتے سوکھ گئی ہیں

آسمان میں سناٹا ہے
بادل بارش نرم ہوا کے
دور دور تک کوئی بھی آثار نہیں ہیں
بھان متی ملبے پر بکھرے
اینٹ اور روڑے
کنکر پتھر
اس امید میں بیٹھی بیٹھی سہلاتی ہے
شاید اک دن
کوئی جادو ہو جائے گا
اس کا اجڑا بکھرا کنبہ
پھر سے جڑ جائے گا۔

آخری پودا

سردی کا
سارا موسم بیت گیا
اب کے برس اونچے پربت پر برف کہیں بھی نہیں گری
پچھلے برس کی بچی کچی کچھ برف تھی آخر وہ بھی باقی نہیں رہی
پربت پر سب پیڑ اور پودے رفتہ رفتہ سوکھ گئے
پربت کے دامن میں ندیا بہتی تھی۔
وہ ندیا اب پیاسی ندیا ریت میں اپنا پاؤں رستہ بھول گئی
مچھلی مینڈک کچھوے کیڑے بھوکے پیاسے
ایک پرانے جوہڑ میں دم توڑ گئے
میدانوں میں وہ جو برقی رو سے اپنے گھر کو روشن رکھتے تھے
لالٹین یا دیے یا موم کی بتی کے
رحم و کرم پر
سناٹے کو اندھیرا سہتے ہیں
اس پر یہ بھی ہوا ستم
اب آنے والا موسم
جلتی آگ کا موسم ہے اور چاروں طرف
طوفانی اور تیز ہوائیں بہتی ہیں

میرے گھر کے آنگن میں
ننھا منا ہرا بھرا
ایک آخری پودا ہے
میں اس دشمن موسم میں
اس کو دیکھ کے شاید اب تک زندہ ہوں
پانی کی اک بوند نہیں
میں اب اپنی آنکھوں کے
باقی ماندہ اشکوں سے
اس کو سینچا رہتا ہوں

رفتہ رفتہ آگ بجھتی جا رہی ہے

آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے
رات لمبی اور کالی ہے، کچھ ایسا
سرد موسم ہے کہ بام و در ہوئے ہیں
آتشِ یخ بستہ جو جلتی تھی اب کچھ
دیر پہلے تک وہ روشن
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

رات کا پہلا پہر ہے اور یہ عالم ابھی سے
اور بھی کچھ
سرد ہو جائے گی
جسم و جاں میں اتر ے گی جو نہی پچھلا پہر ہوگا
ختم کچھ
اور ہو جائے گی تمازت دے رہی تھی جو وہ زندہ
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

اس سے پہلے میرا سب کچھ سرد موسم میں سحر تک
برف ہو جائے، مجھے اس
آگ کو اب تیز کرنا ہے، یہ ممکن ہے یا ناممکن مگر اس
ساعتِ شب میں یہ سب کرنا ہے مجھ کو
آگ بجھتی جا رہی ہے
رفتہ رفتہ
آگ بجھتی جا رہی ہے

تنہا شہسوار

شہسوار
تنہا سا شہسوار
ایستادہ ہے
خمیدہ پشت پر میری
جونہی رکتا ہوں
وہ ترغیب دیتا ہے
مجھے چلنے کی
آوازوں کی سرگم سے
میں چلتا ہوں
میں واماندہ قدم چلتا ہوں
وہ مہمیز کی جنبش سے کہتا ہے کہ دوڑو
اور دوڑو تیز تر سرپٹ چلو
باد فرفتار سے باتیں کرو

اس کا میں زخمی رضا
تیز تر کرتا ہوں رفتار خرام
مجھ کو پہچانا ہے آج
اس کو رنگوں تتلیوں کے دیس میں
جادو نگر میں
میرے سائے کا بھی اب شاید جہاں
منتظر کوئی نہیں
منتظر ہیں اس کے لیکن میرے ننھے دوست کے
دیوتا مست سبز و ارزندہ وقار
دور تک سرگوشیاں کرتے ہوئے اشجار
رقص برگ و بار
جا رہا ہے خواب کی رفتار سے
دیوانہ وار
میرا تنہا شہسوار

بریل

مری آنکھیں سلامت ہیں
مگر میں سینۂ قرطاس پر ابھرے ہوئے خاموش نکتوں کو
بریدہ انگلیوں کی بے نوا بیساکھیوں کے کرب سے بیدار کرنے کی
عجب کوشش میں غلطاں ہوں
کوئی مفہوم خوابیدہ جہاں نکتوں میں مجھ سے ماورا شاید
بصارت کی حدوں سے ماورا جسم
اور اس کے ہر نفس اسرار کی لمبی مسافت میں
میں بیم خوف و وحشت کے
جہنم سے گزرتا ہوں

بڑی مشکل ہے یہ تحریر سے محروم ہوتا ہوں
خدا کا شکر کرتا ہوں
کہ آنکھوں کی مجھے نعمت میسر ہے
مگر یہ ماورائے چشم دستاویز ایسا رزم نامہ ہے
جسے بس لمس کے احساس سے مجھ کو
فضائے خواب پر مقدور کے امکان میں بکھرے
یہ انداز دگر تخلیق کرنا ہے
جسے مجھ کو فقط مجھ کو ہی پڑھنا ہے
جسے مجھ کو فقط مجھ کو سمجھنا ہے

کھنڈر اور پھول

مکاں جل چکا ہے
کھنڈر ہے سیاہی ہے بجھتی ہوئی راکھ کی سسکیاں ہیں
مری آنکھ پرنم ہے
چپ چاپ گم صم کھڑا ہوں یہاں پر
مرے آنسوؤں میں
تصاویر ہیں
ماضی و حال کی
وقت کی منزلوں کی
مرے ذہن میں داستاں ہے
زمانے کے بننے بگڑنے کی
تعمیر و تخریب کی دھڑکنوں کی
مرے کان میں گونجتی ہیں وہ مدھم اور شیریں صدائیں
جنہیں آگ نے اس مکاں کے کھنڈر میں فنا کر دیا ہے
محبت کی قندیلیں
معصوم شمعوں کے اشکوں کی گرمی
دعاؤں کی تڑپتی ہوئی دھاریاں
ان کا پیغام بن کر
فضاؤں میں شاید بھٹکنے لگی ہیں

مری آنکھ پرنم ہے پھر بھی میں خوش ہوں
مرے پاس خوابوں کی معصوم ٹھنڈک
ارادوں کے روشن ستاروں کی نرمی
تخیل کی بہتی ہوئی تشنگی ہے
میں یادوں کے ملبے پہ تخلیق کا پھول لے کر کھڑا ہوں

سبز پتہ

برسوں پہلے مشرقی ساحل پہ اپنی مختصر تعطیل میں
میں نے دیکھے تھے ہوا میں لہلہاتے ناریل کے سبز پیڑ
وہ مجھے
کر گئے سرشار اس انداز میں
جب میں لوٹا پتھروں کے شہر میں
ان کو اپنے ساتھ لے آیا تھا میں
ناریل کے پیڑ میرے دوست مجھ کو پیارے
اس طرح سے نوازتے تھے روز و شب
مجھ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں ان کے طفیل
رنگ و بو کے بھید سب
خانۂ دل میں چھپالوں گا ہمیشہ کے لیے
رفتہ رفتہ بن گئے وہ واجب جاں میرے دیرینہ رفیق
میری مشکل رہگزر پہ میرے ہمراہ دیر تک چلتے رہے

ناریل کے پیڑ اب میری طرح واماندگی کی مضمحل تصویر ہیں
میرے گھر کے پاس ایک
تازہ دم سرسبز اونچا پیڑ تھا
وقت کی یورش میں وہ بھی برگ و گل کے فیض سے محروم پچکایا ہوا
ٹھنٹھ بن کر رہ گیا
کچھ دنوں سے بجز مرا کر ڈھیر ہونے کے لیے
منتظر تھا وہ ہوا کے ایک تھپیڑے کے لیے

آج جب ساون کی پہلی چھم چھما تیز بارش کے سواگت کے لیے
میں نے اپنے گھر کی کھڑکی کھول دی ہے عالم حیرت میں ہوں
سر اٹھا کر مسکرا کر دیکھتا ہے میری جانب پیار سے
ایک ننھا سبز پتہ ٹھنٹھ پر
معجزے سے کم نہیں
یہ نمو فزنۓ مکان کی تحریر یہ تصویر آج

○

آسماں ہو گا یا زمیں ہو گا
حرفِ روشن کا وہ امیں ہو گا
بزمِ یاراں ہے جلوہ گاہ اس کی
ہوا ہو گا تو وہ وہیں ہو گا
شہرِ رسوا میں کل جو آیا تھا
آج بھی وہ وہیں کہیں ہو گا
وہ جو تصویر میں نہیں ڈھلتا
کس قدر شخص وہ حسیں ہو گا
عام سے ہوں گے سب کے سب چہرے
ایک ان میں سے مہ جبیں ہو گا

☆

○

میں ستارہ نہیں ہوں شبنم ہوں
روشنی ہوں ذرا سی مدھم ہوں
قہقہہ ہوں فلک کو چھوتا ہوں
پھر بھی صدیوں سے چشمِ پُرنم ہوں
دوست تو مجھ سے ہنس کے ملتے ہیں
ایک میں ہوں کہ سب سے برہم ہوں
نثر ہوتا تو واشگاف ہوتا
شعر ہوں اس لیے میں مبہم ہوں
ہوش میں ہوں زمیں پہ رہتا ہوں
پھر بھی وارفتگی کا عالم ہوں
سیلِ باراں میں وقفۂ تحریر
سات رنگوں کی ایک سرگم ہوں

○

ذہن میں کوئی خواب رکھ دیتا
دشت میں جوئے آب رکھ دیتا
جلوۂ آفتاب کے اندر
سیرتِ ماہ تاب رکھ دیتا
کچھ تو پڑھتے لگا کے دیدہ ور اس کے
اپنے دل کی کتاب رکھ دیتا
داستاں کو طویل کر دیتا
باب میں اور باب رکھ دیتا
اچھی چیزیں لگیں گی اور اچھی
درمیاں کچھ خراب رکھ دیتا
گر پرستش کا اس کی وعدہ ہے
پاؤں میں اک گلاب رکھ دیتا

☆

○

دوست جب کھل کر ملے اچھے لگے
سارے شکوے اور گلے اچھے لگے
کیا افسردہ تھا موسم آج جب
پیڑ کے پتے ہلے اچھے لگے
خانۂ دل میں اکیلے رہ رہ
رہ گزر پر قافلے اچھے لگے
جو بھی محنت سے ملا بس ٹھیک تھا
کچھ نہ کرنے کے صلے اچھے لگے

☆

"لمحۂ مرگ کا شفیق وقفہ"

بلراج کومل

زمین آغاز ہے
زمین انجام ہے
زمین ادھوریاں ہے
زمین لمحۂ مرگ کا شفیق وقفہ ہے
زمین تسلسل ہے

راجندر سنگھ بیدی کے تعلق سے یہ سب باتیں میرے ذہن میں بیک وقت ابھرتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں:
بیدی پنجاب کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔
بیدی ترقی پسند ہیں۔
بیدی بقول منٹو لکھنے سے قبل بھی سوچتے ہیں لکھتے ہوئے بھی سوچتے ہیں اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہیں۔
بیدی چیخوف کے انداز میں لکھتے ہیں۔
بیدی مشکل افسانہ نگار ہیں۔
بیدی کردار نگاری کے فن میں یکتا ہیں۔

زمین کی پہچان رنگینی سے ہے زندگی کے مظاہرے سے ہے سبزہ اور ماحول سے ہے رشتوں کے تضادوں اور رشتوں کی مفاہمتوں سے ہے۔ بیدی کی کائنات میں یہ سب عناصر موجود ہیں۔ یہ سب عناصر چونکہ بنیادی ہیں اس لیے ان کے ساتھ اکثر اوقات اساطیری اور دیومالائی نوعیتیں وابستہ کی گئی ہیں۔

ان سب آراء کے ہجوم میں راجندر سنگھ بیدی بہر حال زمین کی طرح متواتر اور مسلسل ہیں۔

بیدی کی کائنات کی جسمانی حدود بہت زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ ان کے کردار مرد عورتیں اور بچے۔ زیادہ تر کردار چھوٹے قصبوں چھوٹے شہروں کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان میں اکثر جنم سے موت تک کا سفر یوں تو محدود جغرافیائی حدود میں گزارتے ہیں۔ وہ شہری شعور یا قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح سفر کی لذتوں یا سفر کے مسائل سے دوچار نہیں ہوتے۔ اور اگر وہ منان کی طرح عازم سفر ہو بھی جاتے ہیں تو اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ بیدی کے کچھ کردار بڑے شہروں کے جذباتی تصادموں کے زیر و بم میں سے بھی گزرتے ہیں۔ لاہور، کلکتہ، بمبئی اور بے نام ساحلی شہروں کا ذہنی روحانی اور سماجی کرب برداشت کرتے ہیں اور بالآخر زندگی کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ طبقہ واری تقسیم کے میزان کے مطابق بیدی کے اکثر کردار نچلے درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے کے کردار اور اونچے طبقے کے کردار بیدی کے ہاں خال خال نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ ایسے مرد عورتیں اور بچے ان کی دنیا میں آباد ہیں جن کو فیصلہ کن انداز میں مخصوص حد بندیوں میں قید کرنا ممکن نہیں ہے۔ بیدی کے ہاں زیادہ تر مرد دکاندار، چھوٹے کاروبار کرنے والے لوگ، نوکری پیشہ سرکاری یا غیر سرکاری ملازم، ڈرائیور اور مختلف غیر واضح تفصیلات کے افراد ہیں۔ گھمو رام، علی جی، حلیم، جے رام، مادھو، بھڑا لال، مدن، بھاگی، سندر لال، موہن جام سپاری والا، گیان پت، مگن ٹھلے، مکندی، گل بابو، مادھو، کنگا، منگل، پچھمن مرادی لال، سیٹھ بھنڈارا، گھمنڈی لال، چاچا رام دھان، ست رام۔ سب کردار بیدی کی مٹھی بھر دنیا کے رہنے والے لوگ ہیں۔ ان کے رویے، کچھ رویے طبقاتی نوعیت کے ہیں۔ بیدی کے یہ سب کردار اکثر اوقات کثیر الجہت کردار ثابت ہوتے ہیں۔ ان کی بہت سی پرتیں اور گتھیاں ہیں جو مختلف تصادموں میں آپ سے آپ ابھرتی ہیں۔ گھمو رام، سپاری والا، گیان پت، مگن ٹھلے، بظاہر سیدھے سادے انسان ہیں لیکن جنسی اور سماجی تضادات کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ بیدی کے وہ کردار جو زوال عمر کے نشیب میں پہنچ چکے ہیں یا زوال عمر کے نشیب کے قرب و جوار میں ہیں کم و بیش شفیق اور فراخ دل ہیں۔ اور تضادات میں گرفتار ہونے کے باوجود ہمدردانہ جذبات سے معمور ہیں۔ ست رام، حضور سنگھ، سندر لال۔ سب تضادات میں گرفتار ہیں۔ سب ہمدردانہ جذبات سے معمور ہیں۔ بیدی ان سب میں شامل بھی ہیں اور ان سے الگ بھی۔ جب بیدی بطور راوی خود بیانیہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو کئی بار اچھے مفید لیکن کہانی کے تعلق سے غیر ضروری خیالات کہانی میں شامل کر دیتے ہیں۔ وہ افسانے جن میں بیدی کا انداز خود نوشت سوانحی، یا اعتراف ذات کا ہے "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"، "آئینے کے سامنے" بیدی کے فن کی جانی پہچانی سطح سے نیچے رہ جاتے ہیں۔

بیدی اپنے ان سب مرد کرداروں کا اخلاقی محاکمہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ آیئے دیکھیں بیدی اپنے نسوانی کرداروں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

ہولی۔ گرہن کی رات کو ایک ہتھیارے سے فرار ہونے کے عمل میں ایک بیڑا اچکا

تیسری بار کوشش کی۔ اس بار اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟" کیا کرتے ہو اور یہاں کس لیے آئے ہو؟

اجنبی نے اپنی آنکھیں کنویں کے چبوترے سے ہٹائیں اور کوفلر کے چہرے پر گاڑ دیں۔ کوفلر کو یکایک محسوس ہوا کہ اجنبی اس کی روح کے اندر جھانک رہا ہے اور اس کے ہر راز سے واقف ہوتا جا رہا ہے کوفلر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس سے پیشتر کہ کوفلر اپنے غصہ کا اظہار کر پاتا، اجنبی کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے ـــــ دو انسانوں کے درمیان ہم دردی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ان کے مقاصد ایک جیسے ہوں۔

"تو تم ہم دردی کی تلاش میں ہو۔"

"شاید میں نے غلط لفظ استعمال کیا۔ مجھے رشتہ یا تعلق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا ہوں۔"

کوفلر چکر میں آ گیا۔ عجیب آدمی سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اجنبی کو کچھ دیر بے بسی کے عالم میں دیکھتا رہا اور پھر بولا

"دیکھو میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں' تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں واپس جانے کے لیے یہاں نہیں آیا ہوں۔ تم چاہو تو یہاں سے جا سکتے ہو۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" کوفلر نے پوچھا۔

"میں چاہتے ہوئے نہ چاہنے کے عمل سے بہت دور نکل چکا ہوں۔"

کوفلر کے ذہن میں ایک اور سوال کوندے کی طرح لپکا۔

"کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے زندگی اور موت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا" اجنبی نے جواب دیا۔

کوفلر کے چہرے پر مسرت اور اطمینان کی روشنی نمودار ہوئی۔ وہ اجنبی کی پر اسرار شخصیت کے ایک گوشے کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"کیا تم جانتے ہو کہ میں کس مقصد سے یہاں آیا ہوں"

"مجھے اب دوسروں کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"

کوفلر کی حیرت میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"یقیناً تمہارا گھر ہو گا" تمہاری بیوی ہو گی' بچے ہوں گے"

"تھے اب نہیں ہیں" اجنبی نے ایک بار پھر کنویں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"کہاں گئے"

"مر گئے"

"کس طرح مر گئے؟"

"جس طرح انسان مرتے ہیں۔ بھوک سے' بیماری سے' قتل سے"

"یہ تو عام بات ہوئی۔ خاص طور پر تمہاری بیوی اور تمہارے بچے کیسے مرے؟"

اجنبی شاید کوفلر کے ضرورت سے زیادہ سوالوں کا جواب دے چکا تھا۔ اس لیے برہم ہو کر بولا

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا تم مجھے مجبور کیوں کر رہے ہو؟"

کچھ سوالوں کا جواب تم نے اپنی مرضی سے دیا ہے۔ ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ دلچسپی ہو گئی ہے۔ میں تمہارے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوں۔

دوستی کے نام پر اجنبی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پورے زور سے چیخا

"چلے جاؤ یہاں سے۔ تم کون ہوتے ہو میرے ساتھ دوستی کرنے والے۔"

کوفلر مسکرایا

"میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"تو پھر کون ہو؟" اجنبی سوال پوچھ کر اپنے سوال پر خود شرمندہ ہو گیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ٹھیک یہی سوال میں نے تم سے پوچھا تھا۔ جس کا جواب دینے سے تم نے انکار کر دیا تھا لیکن میں انکار نہیں کروں گا میرا نام کوفلر ہے میرے نام سے اس شہر کے تمام لوگ واقف ہیں۔ میں مشہور کنویں پھلانگنے والا ہوں۔

"مجھے تمہارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"تمہیں میرے ساتھ دلچسپی ہے۔ اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں کون ہوں؟"

اجنبی کی آنکھوں میں غصے کی ایک لہر ابھر آئی اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا

"مجھے کنویں پھلانگنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"نہ سہی۔ لیکن میں کنویں پھلانگنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرتے ہو۔ جھوٹ' چوری' ڈاکہ زنی' قتل' زنا بالجبر ـــــ

اجنبی کے یہ الفاظ سن کر کوفلر سناٹے میں آ گیا۔

"شاید تم اپنے کارناموں کی تفصیل پیش کر رہے ہو"

"جی ہاں سارے تمہارے تمام ہنرمندیوں کے"

"لیکن تمہارے بیوی بچے کیا ہوئے؟"

اجنبی کی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ اس سوال کے جواب سے بھی کترا جانا چاہتا ہے۔

"جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل ـــــ"

"لیکن انسان کی زندگی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہے"

کاشغر نے اسے درمیان میں ٹوک دیا میں تمام قصوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہ مت بھولو کہ تم کنویں پھلانگتے پھلانگتے زندگی کے رازداں بھی بن گئے ہو"

"خودکشی سے صرف تمہارا مسئلہ حل ہوتا ہے"

"ہر انسان اپنا ہی مسئلہ تو حل کرتا ہے"

کاشغر کو اجنبی کی باتوں سے جو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی مزید گہری ہو گئی۔

"لیکن اس زندگی کے دوسرے اہم مسائل بھی تو ہیں جو میری اور تمہاری ذات کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں"

"جی ہاں! میں ان سے بھی واقف ہوں ان پر بھی جھوٹ، چوری، ڈاکہ زنی، قتل وغیرہ حاوی ہیں۔ فرد سے اجتماع تک پہنچتے پہنچتے تفصیلات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔"

"فرض کرو تم خودکشی کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہو جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ میں تمہیں ہرگز ایسا کرنے نہیں دوں گا تو کیا تمہارے ذاتی مسائل اور دنیا کے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

مجھے اس سوال کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے مسائل حل ہوں یا نہ ہوں میں اپنا آخری فیصلہ کر چکا ہوں اور پھر میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا کا کوئی اجتماعی مسئلہ فیصلہ کن طریقے سے ہمیشہ کیلئے کبھی حل نہیں ہوتا صرف عارضی طور پر حل ہوتا ہے میں صرف اپنا مسئلہ حل کرنا چاہتا ہوں"

"تم نادان ہو"

"کون جانتا ہے کون نادان ہے"

دونوں آدمی اپنے اپنے سوالات اور جوابات میں الجھ گئے تھے۔ تھوڑی دیر کیلئے دونوں خاموش ہو گئے گفتگو کا دوبارہ آغاز اجنبی نے کیا۔

"تم یہاں سے چلے جاؤ میں اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنا چاہتا ہوں"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے پہلے اپنے کسی فیصلے پر عمل نہیں کر سکے" اجنبی کے چہرے پر جھلاہٹ پیدا ہو گئی۔

"میں اپنے ہر فیصلے پر عمل کرتا ہوں"

"تو پھر اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے ہچکچاہٹ کیوں۔ تم اپنا مسئلہ ملتوی کیوں کرنا چاہتے ہو"

اجنبی کے چہرے پر مزید غصے کے آثار پیدا ہوئے

"میں نے کہا نا کہ میں اپنے آخری فیصلے پر فوراً عمل کرنا چاہتا ہوں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ"

"اگر یہ فیصلہ تمہارا آخری ہے اور تم اس پر عمل بھی فوراً کرنا چاہتے ہو تو میری موجودگی سے تمہیں کیا زحمت ہے"

میں اپنی موت کے عمل میں تنہا شامل ہونا چاہتا ہوں تم میری موت کے گواہ نہیں بن سکتے میں یہ حق تمہیں کبھی نہیں دے سکتا۔

"میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ زندگی خوبصورت ہے زندہ رہنے کی کوشش کرو"

"مجھے تمہارے امید افزا الفاظ بے معنی نظر آتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر زندگی خوبصورت بھی ہے تو تمہیں اس سے لطف اندوز ہونے کی پوری آزادی ہے تم میرے معاملے میں ٹانگ کیوں اڑا رہے ہو؟"

"اس کا مطلب ہے تم اپنے آخری فیصلے پر عمل کرنے پر بضد ہو۔ تم بخوشی خودکشی کرو میں یہاں سے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر کاشغر وہاں سے چل پڑا۔ اجنبی کنویں کی منڈیر پر چڑھ گیا اور کنویں کے اندر کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔

کاشغر دو چار قدم چلنے کے بعد رک گیا اور واپس اسی جگہ آ گیا جہاں وہ چند لمحے پہلے کھڑا تھا۔

"میرا آخری سوال باقی ہے"

"پوچھو" اجنبی نے ناگوار انداز میں کہا۔

"تم نے خودکشی کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟"

"تم نے پھلانگنے کے لیے یہ کنواں کیوں منتخب کیا؟

"میرے لیے یہ کنواں مناسب تھا۔"

"ٹھیک یہی بات میں کہتا ہوں۔ یہ کنواں میرے لئے مناسب تھا"

اس جواب سے کاشغر کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"کیا تم اپنی خودکشی چند روز کے لیے ملتوی کر سکتے ہو"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں کنواں پھلانگنے کی مشق کیلئے آیا تھا۔ کیوں کہ مجھے دو روز بعد کنواں پھلانگنے کے ایک مقابلے میں حصہ لینا ہے"

"تو میں کیا کروں؟ تم سمجھتے ہو اس طرح سے تم مجھے متاثر کر لو گے"

زہے عز و شرف

مدینے والے

لے کے آیا ہوں مناجات ۔ مدینے والے
ٹھیک ہوتے نہیں حالات ۔ مدینے والے

صبحِ آزادیٔ کامل کو ترستی امت
ختم ہوتی ہی نہیں رات ۔ مدینے والے

خون بہتا ہے تو بہتا ہی چلا جاتا ہے
شہر در شہر ہیں اموات ۔ مدینے والے

پھر سے دربار میں حاضر ہے زہے عز و شرف
آپ کی ہیں یہ عنایات ۔ مدینے والے

کھلتے جاتے تھے کسی دور میں سب در ہم پر
اب تو بنتی ہی نہیں بات ۔ مدینے والے

علم بڑھتا ہی رہے ۔ ربِّ شرح لی صدری
فکر کو تازہ خیالات ۔ مدینے والے

الاماں! امتِ مظلوم ہے فریاد کناں
روک دے ظلم کا ہر ہاتھ ۔ مدینے والے

نئے ذہنوں میں سوالات جنم لیتے ہیں
نہیں ملتے ہیں جوابات ۔ مدینے والے

دین پر جن کا اجارہ ہے ۔ نہیں جانتے ہیں
کیا ہیں اس نسل کے جذبات ۔ مدینے والے

کتنے دریا ہیں عقیدت کے شب و روز رواں
چشم در چشم ہے برسات ۔ مدینے والے

موج در موج چلے آتے ہیں عشاق یہاں
اک سمندر ہے تری ذات ۔ مدینے والے

کفر تو ملتِ واحد ہے منظم بھی ہے
ہوں مسلمان بھی اک ساتھ ۔ مدینے والے

محمود شام (کراچی)

''گنبدیدہ''

(گنبدیدہ کے ترتیل آخر کو زبد
خود بھی کامل دین بھی جس کا کامل)

ہے راہِ خدا جلوہ گہِ ناز محمدؐ
جب دیکھیے سجدے میں سرِ ناز محمدؐ

قرآن کے آہنگ سے گونج ہے یقیں
آوازۂ الہام ہے آواز محمدؐ

بے کھٹکے چلا آئے جو جویا جو بھی حق کا
بے حاجب و درباں ہے درِ باز محمدؐ

پایانِ سفر ہے جو رسولانِ سلف کا
در اصل ہے وہ نقطۂ آغاز محمدؐ

بے دم ہو نہ کیوں ہیکِ تخیل کہ پرے ہے
ہر سرحدِ ادراک سے پرواز محمدؐ

ختمِ رسل تھیں جو سب سے بے لیت و لعل لو
اس سے کرو اندازۂ اعزاز محمدؐ

ہے اس کا وجود انفس و آفاق میں یکتا
ہو کیوں نہ کہ ہے منبعِ اعجاز محمدؐ

یکدم بنے وہ ذرہ دُرِ ناب کہ جس پر
پڑ جائے نگہِ غلط انداز محمدؐ

منظورِ نظر اس کا سرافراز دو عالم
ترسانِ مجسم نظر انداز محمدؐ

کو حوصلۂ نطق نہیں نوکِ زباں کو
ہے سینۂ خالد حرمِ راز محمدؐ

وہ خالدِ دل سوختہ وہ شاعرِ مرتاض
ہے جو ہمہ زمزمہ پرواز محمدؐ

عبدالعزیز خالد (مرحوم)

شکار ہو پرندوں کو لہو رنگ چونچیں، لہو رنگ پنجے

حمیدہ معین رضوی (لندن)

فون بجتا ہی چلا گیا مگر جب میں نے ہیلو کہا تو ایک مردانہ آواز آئی۔ ہیلو۔ کئی دفعہ میں نے ہیلو کہا تو ادھر سے ٹوٹی بھری آواز آئی ــــــ خالہ جی میں ہوں۔ یہ ظاہر تھا کہ میرے بھانجے اطہر کی آواز تھی اور بہت بھرائی ہوئی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا میں ایک گھنٹے میں پھر فون کروں گا لائن خراب ہے میں نے فون واپس رکھ دیا۔ اور ذہن خیال کی وادیوں میں بھٹکنے لگا چھ سال قبل ایک شام اسی وقت ساحرہ کا فون آیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا عجیب اداسی کا عالم تھا۔ سنڈ درختوں کے نیچے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا جیسے بہار کا جنازہ خزاں کے دوش پر اٹھا ہوا ہو ایسے میں ساحرہ کی اداس آواز جو درد سے ڈوبی ہوئی تھی، سن کر پریشان ہو گئی۔

"میں نے سنا ہے تم پاکستان آ رہی ہو کم از کم دو ہفتے میرے لئے میرے گھر کے لئے رکھنا تم سے کسی بہت ہی سنجیدہ مسئلے پر بات کرنی ہے" "کیا بیٹے کا رشتہ کر رہی ہو؟" میں نے ایسے ہی مزاقاً کہا اور ہنس رہی ہو گئی۔

"تمہیں ٹھٹھولیاں سوجھی ہیں ــــ یہ مذاق نہ کرو زندگی موت کا مسئلہ ہے" اس کی آواز بھرا گئی اور میں نے فوراً معافی مانگی۔ دسمبر میں مجھے اکثر ساحرہ یاد آتی ہے میری اس کی پہلی ملاقات بھی دسمبر میں ہوئی تھی وہ کالج کا یوم تاسیس تھا اس دن ہم اردو مضامین کا مقابلہ تھا اگرچہ میں پہلے سال میں تھی مگر اول انعام میں نے جیتا تھا اس نے مجھے گھیر لیا۔ چلو اسی خوشی میں تمہیں چائے پلائیں۔ پھر ہم بہت دیر تک کالج کی اکلوتی کینٹین میں جا بیٹھے۔ "کیا پتہ چلا وہ ہماری رشتہ دار بھی نکلی ہے اور یہ بھی کہ ہماری تاریخ پیدائش بھی دسمبر کے آخری ہفتے کی ہے" اس نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں ایک راز بتاؤں؟ تمام باغی روزگار دسمبر میں پیدا ہوتے ہیں تمہارا تو مجھے معلوم نہیں میں تو ہوں غیر معمولی ذہین اور تم کیا بغیر روزگار" میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی۔ "یہ کیا؟" یہی مطلب تھا۔ اپنی کم گو کم آمیز سکھی کو جتلانا چاہتی تھی کیوں گزشتہ دو ماہ سال سے میں نے رابطہ کیا نہ میں نے۔ ہم زمانے کی گردش کو دوری کی اور جانے نہ لاتے کیوں نہیں رابطہ کیا۔ اس سے رابطہ ہمیشہ گہری مسرت کا باعث ہوتا تھا ہم دونوں کے لئے۔ فون ختم ہو گیا مگر ــــ وہ وقت وہ لمحے جو ہاتھوں سے نکل گئے لوٹ آئے ــــ وہ زندہ رہیں گے جب تک میں زندہ ہوں اور باشعور ہوں۔ میرے ذہن میں فلم چل پڑی۔ میں فون کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ہمارا کالج ان دنوں کچھ عجیب چیز لگتا تھا آپ بھی سوچئے مگر آنکھیں بند کر کے۔ ایک بڑا سا گیٹ ہے تقریباً بیس فٹ چوڑا دروازہ اس میں داخل ہوتے تھا بجری چوڑا راستہ، راستے روش کے دونوں طرف دو دو فٹ چوڑی کیاریاں جن میں گلاب کے پھول بھرے ہوئے اور کناروں پہ رنگ برنگے بارڈر، چاندنی اور پھر قد نکالا کرتے ہوئے بیلو شیشم اور نیم کے درخت جن میں سے بنگال سے دھوپ چھن کر آجائے اس لمبے راستے کے دونوں طرف گھاس سے بھرے میدان جن کے بیچ سے راستہ گزر کر ایک جگہ ختم ہوتا تو اسکے دونوں طرف دائیں بائیں بیس فٹ کا محوری راستہ پھر اسکے آگے ایک اکلوتی عمارت جیسے ایک ٹرین کھڑی ہے وہ اکلوتی عمارت تقریباً بیس کمروں پہ مشتمل تھی دس کمرے اس راستے کی دائیں طرف اور دس بائیں طرف کمروں کے آگے دس فٹ چوڑی محراب دار دالان پرانی اینٹوں کا فرش، کمروں کے دروازے دالان میں کھلتے اور دروازے کے مخالف سمت پہ بڑی بڑی لوہے کی چوکھٹوں والی کھڑکیاں جن کے سامنے میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت انگریزی نما عمارت کے ایک سرے پہ اکیٹ اور دوسرے سرے پہ سٹاف روم، یہی ہمارا ڈگری کالج تھا۔ ایک اہم چیز اور گیٹ میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف مڑ جائیں تو ــــ پہلی بیس کمروں کی مستطیل عمارت تھی جو ہوسٹل کہلاتی تھی اور اس کی چار دیواری کے باہر کیلے کے درختوں کے جھنڈ میں ایک رہٹ تھا اور اسکو ایک بیل کھینچا کرتا چھوٹے چھوٹے ڈولوں کی زنجیر کنویں کے اندر جاتی اور ڈولوں میں پانی بھر کر اوپر آتی پانی ایک ڈبے نما ایک ٹین کے برتن میں خالی ہو کر نیچے واپس کنویں میں چلے جاتے اور پانی ڈولوں سے برتن حوض میں اور حوض سے کیاریوں اور وہاں سے کھیتوں کی طرف زندگی کے ایک طویل سفر پہ روانہ ہو جاتا۔ ڈولوں کا کنویں میں آنا جانا مجھے ایک سحر میں مبتلا کر دیتا کالج کی چار دیواری کی دوسری طرف ایک بیل کی ٹوپ ٹوپ، قدموں کی ٹوک، گھاس پہ بیٹھی جب بڑی تسبیح، ان سب میں ہوتا دوسری مثنوی مولانا روم کے تو اور پھر کبھی اور علامہ اقبال کی بال جبریل کے حوالے سے نظم پھر ــــ بیل اور بیج اور قدموں کی مرکب آوازوں کے جادو پہ غور کر رہی ہوتی تو ساحرہ مجھے پیچھے سے آ کر ڈراتی ــــ چلو تمہارا نظم کا گھنٹی بج گئی۔

اس کالج کی ایک اور تاریخی حیثیت تھی پہلے اسے سیالکوٹ کا گرلز ہائی سکول کہا جاتا تھا، جس میں جو گنسا ہائی کے علاوہ بھی مشاہیر پڑھے تھے اور پھر ۱۹۴۷ء ــ ۴۸ کے خوفناک دور میں جموں سے آئے مہاجرین کے لئے کیمپ ۱۹۴۹ تک لوگوں کو گھروں میں بسا دیا گیا جس کے بعد قائد اعظم کے دورہ سیالکوٹ پہ لوگوں نے لڑکیوں کے کالج کا پر زور مطالبہ کیا اس وقت جمہوریت ہوتی تھی اس لئے فوراً احکامات کے ذریعے کالج ہنگامی بنیادوں پہ کھول دیا گیا مگر واہ رے بدقسمتی قائد اعظم چلے گئے پھر لیاقت علی چلے گئے پھر جمہوریت گئی ہماری بد قسمتی ہم کالج پہنچے تو ایوب صاحب ایوان صدر میں تشریف لا رہے تھے۔ جب ہم ڈگری لے کر یونیورسٹی پہنچے تو وہ تب بھی وہیں براجمان تھے۔ ہم وہ بدنصیب نسل تھے کہ ہم نے کبھی اپنے ملک کے انتخابات میں حصہ ہی نہیں لیا۔ جب انتخابات ہوئے تو ہماری عمریں تھیں ووٹ دینے کی حالانکہ ہم بزعم خود اس قابل تھے کہ سیاستدانوں کو مشورہ دے سکتے تھے کاش انہوں نے ہماری وہ زور دار تقریریں ہی سنی ہوتیں جو ہم کالج کے اسٹیج پر کرتے تھے تو کبھی ضرور مشورے کے لئے فی الفور

کو دیکھ کر میں دل سے خوش ہوتی رہی اور جتنا ٹوٹ کر رشک بھی کرتی رہی، کیا کہ وہ
ہوا مجھے بڑی سے بڑی ملازمت کا کر رہے تھے کی ۔۔۔ وہ دونوں برابر پر برات میں
مجھے مشورہ لیتے مگر وہ ان تین سالوں سے میں کچھ غم ذات اور کچھ غم کائنات
میں ایسی مصروف ہوئی کہ کسی سے تعلق ہی نہ رکھا ۔۔۔۔۔۔ تھکی ۔۔۔۔۔ تھکن
ہے معلوم ہو میں کیسے کرب سے گزر رہی ہوں ۔۔۔۔ تھکن ہے کہ چونکہ اسکا
شوہر محبت کرنے والا مثالی شخص تھا اسلئے میں نے طے کر لیا کہ اسکو بھی کوئی مسئلہ
نہیں ہو سکتا ۔۔۔ مسئلہ تو شوہر پیدا کرتے ہیں اگر وہ کاؤ مضبوط ہو تو کوئی دکھ ہو ہی
نہیں سکتا مگر ماہ تر نے تو مجھے فکرمند کر دیا ہے وہ واقعی اداس تھی۔ تو کیا دس
سال محبت میں تڑپنے والا ۔۔۔ شوہر بھی ۔۔۔۔ نہیں اسے شوہر کی طرف سے کوئی
مسئلہ نہیں ہو سکتا آخر وہ بیاہی کو میں نے approve کیا تھا۔

بچے بڑے ہو کر گھونسلہ چھوڑ دیتے ہیں بچے رہنا بھی چاہیں تو
میرے شوہر جیسے مغرب زدہ لوگ خود گے بار بار کر انہیں بھگا دیتے ہیں اور تنہا
مرنے کو پسند کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی پرائیویسی عزیز ہے اب آپ مشرق میں سوال کریں
گے کس لئے؟ یہ انہیں سے پوچھئے مجھے تو اس وقت یہ معلوم ہے کہ بچے
کلینک میں مدد کر دیتے تھے۔ اب تنہا مجبوری ہوں تھک جاتی تو بچے ہاتھ بٹا دیا
دیتے تھے، بیماری میں تیمارداری کرتے اب یہ ہے کہ ۔۔۔۔ ہو گر مر جائے تو
ڈھونڈ خوں کوئی نہ ہو۔ دس سال قبل میں ماہ تر کے گھر گئی تھی میرے بچے اس
وقت سولہ اٹھارہ کے تھے ان کے بچے آٹھ اور دس کے تھے۔ بچے سب ایک کمرے
میں سو گئے تھے میں اور ماہ تر ایک کمرے میں ہم نے ساری رات باتیں کی تھیں
اور جیسے تھے اور میرے بچوں نے تبصرہ کیا تھا۔

"ممی آپ دونوں تو ٹین ایجرز کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں کاش
آپ ایسے ہی گھر پر بھی خوش رہا کریں" میں لاجواب سی ہو گئی زندگی میں ہر بات
کا جواب ہے بھی کہاں؟

میرا ذہن پھر ماہ تر کی طرف اور اسکے ساتھ گزاری زندگی کی طرف مڑ گیا۔ جیسے
کی سردی پڑ رہی تھی پنجاب میں درجہ حرارت انجماد تک پہنچ چکا تھا جنوری کی
ہی کوئی تاریخ تھی ہمیں کسی بین الکلیاتی مقابلہ میں جانا تھا وہ مشاعرہ میں گئی تھی
میں مشاعرہ اور تقریر دونوں میں ہم نے سفر میں ساری رات باتیں کیں جب ہم
ملتان کے اسٹیشن پہ اترے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی اور ہمیں اپنے گرم لباسوں میں
ایسے گرمی لگ رہی تھی جیسے ہم سیالکوٹ سے نہیں یورپ سے آ رہے ہیں کالج میں
انہوں نے ہمیں سیدھے ہوسٹل پہنچا دیا تھا کالج کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد بھی
تھی ہم نے بڑے جوش و خروش سے اس میں نماز ادا کی ہم نے پہلی بار ریگستان
میں پو پھٹنے کا منظر دیکھا اور پھر کیا ہم تھک رہا تھا تو ہم بے سدھ ہو کر بستروں میں جا
سوئے تھے۔ اس شام کالج والے باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو کوئی ورائٹی
پروگرام دکھا رہے تھے ہم نے شام اپنی اپنی غزلوں کی نوک پلک درست کرنے

میں گزاری۔ مشاعرے کے بعد ملک کی سیاست سے لیکر دنیا بھر کی سیاست پر اپنے
تئیں عالمانہ بحثیں کیں آج کی زندگی کو دیکھتے ہوئے احمقانہ خود اعتمادی کی خود
نمائی کی۔ اس بڑے سے ہال میں کوئی بارہ بستر تھے اور مختلف شہروں سے آئی
ہوئی talented teen agers اپنی ذہانت کا سکہ
جما رہی تھیں روشن لوگوں کے انداز میں بستروں پر دراز باتیں کرتے کرتے
دیر سے دیر سے سب سو گئے۔ پھر جگایا ہمیں کھانے اور شو کے لئے جگایا گیا
خیمے میں پہنچے تو انہوں نے منٹو کا ڈرامہ "تیج تہوار میں" سٹیج کیا تھا۔ مجھے یاد
ہے ہمارے کچھ پلے بھی نہیں پڑا تھا مگر دل میں ہمیں اچھا لگا۔ دن بھر سو کر ہم تمام
رات جاگے آخری شفٹ میں ہمارے کمرے والوں نے سوچتے ہوئے کہا شروع کیا
اس دن تقریروں کا مقابلہ جو گیارہ بجے شروع ہوا تھا۔ شام کو کھانے کے بعد
مشاعرہ ہوا تھا ہماری حالت نیند سے ابتر تھی ہمیں خوب ڈانٹ پڑی "بھول جاؤ
کہ ٹرافی جیتنا ہے" ہماری لیکچرار انچارج کہہ رہی تھیں وہ مگ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ
رہی ہیں پھر یہ کتنا خرچہ ہوا ہے پرنسپل تنگ کریں گی۔ اس سال کہیں جانے
کے لئے، ہارنے والے گھوڑے پہ کوئی پیسہ نہیں لگاتا، ہمیں گھوڑے والی مثال بہت
بُری لگی تھی مگر سوائے خاموشی کے چارہ کیا تھا غلطی بھی ہماری تھی ہمارے پاس
سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔ وہ غصہ میں پیر پٹختی کمرے سے باہر چلی گئیں اور
ہم نے دعائیں مانگیں کہ کوئی معجزہ ہو جائے۔ اور سو گئے آنکھ کھلی تو ایک بج رہے
تھے مجھی پروگرام شروع ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا بدحواسی میں اٹھ کر کھڑی ہوئی
تو دھم سے گری پھر اٹھ کر بدحواس ہو گیا شور سے سب جاگ اٹھے اور دوڑے
ہال کی طرف بدحواس بولی ہے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس دن سے آج تک
میں اکثر یہ خواب دیکھا کرتی ہوں کہ میں کسی مقابلہ میں گئی ہوں اور سو گئی ہوں اور
مقابلہ ختم ہو چکا ہے۔

بہر حال معلوم ہوا کہ محمد علی بوگرہ کے انتقال کی وجہ سے اس دن کے
سب پروگرام ملتوی ہو گئے۔ ہم سب نے آسمان کی طرف دیکھ کر شکرانے میں دعا
کے لئے ہاتھ اٹھائے آپ یقین کیجئیے ہم بے حس تھے اور ہمیں خدا نخواستہ محمد علی
بوگرہ کے انتقال کا افسوس نہیں تھا بس جانے کیوں آسمان کی طرف دیکھا جس پہ
ملتان کا تیز سورج چمک رہا تھا اور گرمی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ سیالکوٹ کے انجماد
کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ ہم نے کس کی رسوائی اور ہمارے اوپر یقین
نہیں لگا اور ہم تیسری بار ڈرامائی جیت کر لے گئے اللہ تعالیٰ رحمت کرے بوگرہ کو
اسلئے بھی کہ محمد علی بوگرہ کا نام سے ایک اور یاد وابستہ ہو گئی ہے قدسیہ آپا مرحومہ
کی سہ میرے اسلامک لیکچر میں آیا کرتی تھیں ایک دن وہ میرے لئے کوئی
خاص کھانا پکا کر لائی تھیں بدقسمتی سے اس دن مجھے لیکچر ملتوی کرنا پڑا مجھے ایک
کانفرنس میں جانا تھا وہ ایک ہفتہ پہلے بتا دیا گیا تھا وہ اس ہفتے آ نہ سکی تھیں اسلئے
انہیں معلوم نہ تھا اگلے ہفتے میں آئی تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے کھانا پکا کر لائی
تھیں اور دوسری وجہ سے پوری کلاس کیلئے کھانا لائی تھیں۔ اس دن وہ نہ آ سکی تھیں
جانے کیوں مجھے بہت افسوس ہوا جیسے کوئی بہت قیمتی اثاثہ کھو گیا ہو۔ سوچا تھا مگر

پہنچ کر فون کروں گی شکریہ کروں گی جانے کیوں انکی صورت آنکھوں میں پھرتی رہی گلابی رنگ، نازک سراپا خوبصورت نقوش چھوٹا قد مناسب جسم بنگالی تھیں اور اس نسل سے تعلق رکھتی تھیں جس نے ہمیشہ اسلامی بھائی چارہ میں یقین رکھا۔ میں جب بھی پہنچتی۔

"قدسیہ آپا اگر آپکو اردو میں مشکل لگے تو میں انگلش میں تشریح کروں" وہ خوشدلی سے اپنی پیاری سی اردو میں کہتیں۔ "نہیں تمہارے منہ سے اردو اتنی اچھی لگتی ہے کہ میں اور کسی زبان میں سننا پسند نہیں کروں گی۔ پھر مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی ہے تو پھر ـــــ؟" اور پھر اس دن وہ نظر آ گئیں میں نے سوچا قدسیہ آپا خفا ہو گئیں۔ خیر مناؤں گی انکا تو مجھے چاہتی ہے بقول لوگوں کے "جہاں تمہارا پسینہ گرے وہاں خون بہا دیں۔" میں چائے پیتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پیاری قدسیہ آپا جنکی ایم اے کے دوران اپنے سے پندرہ سال بڑے شخص سے شادی ہوئی۔ بچہ کوئی نہیں تھا انہیں بیوہ ہوئے پندرہ سال ہو چکے تھے لندن کے ایک اونچے لوگوں کے علاقے میں ایک فلیٹ تھا جہاں انہوں نے کتنا دکھ گزارا اور زندگی کی مصروفیات کاش جانتی کہ اس دن میں نے چائے پیتے ہوئے طے کیا کہ میں اگلے ہفتے جاؤں گی وقت نکال کر جاؤں گی۔ آج میں پانچ برس بعد سوچ رہی ہوں۔ وقت انسان کے رشتے کیسے اور کہاں کہاں جوڑتا ہے اور کیسے زبردستی توڑ دیتا ہے جیسے انسان روئی ہے جس سے وقت کا چرخہ سوت کا تار رہتا ہے اور جب چاہتا ہے وقت کا معمار اس کچے سوت کو پھر سے نوچ کر دھنک دیتا ہے جیسے قرآن حکیم میں ہے "اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت مضبوط کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر کے توڑ ڈالا"۔

اس دن وقت نے میری زندگی کا ایک سوت کو بھی پھر سے دھنک ڈالا۔ قدسیہ آپا وقت نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں اس دن فون کرتی رہی وہ نہیں ملیں کاش ـــ صبح میں کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو میری اور انکی مشترکہ دوست کا فون آیا ابھی گھنٹہ پہلے قدسیہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ خاتون ڈاکٹر ہیں انھوں نے ہی دو بجے رات کو قدسیہ آپا کو ہسپتال داخل کروایا تھا۔ قدسیہ آپا اتنی مطمئن نظر آ رہی تھیں کہ ڈاکٹر جو ڈیوٹی پہ تھے وہ بھی دھوکہ کھا گئے ہسپتال کے ڈاکٹروں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ جا رہی ہیں یا جا چکی تھیں۔ سوچا کہ ہسپتال میں دیکھ آؤں گی کالج سے۔ مگر غسل، جنازہ ہسپتال سے مسجد اور وہاں سے قبرستان پہنچ گیا کچھ رشتہ داروں کو جا کر انکی تقسیم کی بہت جلدی تھی کچھ دنوں بعد بنگلہ دیش سے آئی ہوئی بہنوں نے انکی ڈائری دکھائی کہ ہم سب کو یاد کیا ہم نے دعا کی۔

سارے فلیٹ میں گھوم کر دیکھا۔ دیوار پہ تصویریں لگی تھیں۔ پہلی تصویر پہ نظر پڑی دو فٹ لمبی ایک فٹ چوڑی تھی قدسیہ آپا مرحوم شوہر جوان خوبصورت لڑکی سی دلہن بن کر کے ساتھ تھیں انکی بہن نے بتایا دلہن بن کر ہمارے ماموں تھے۔ غیر از خاندانوں، حبیب الرحمن، اور بہت سے ... کے ساتھ انکی تصاویر تھیں، میرا دل تڑپ کر رہ گیا، قدسیہ آپا کا غم دوچند ہو گیا مجھے محسوس ہوا پاکستان آدھے دھڑ سے ابھی ابھی مطلوع ہوا ہے کیسی چمکتی تھیں کس کی نظر کھا گئی پاکستان کو۔ میں آج تک ماتم کر رہی ہوں پاکستان سے زیادہ قدسیہ آپا کا وقت انسان کو کیسی کیسی پھبتیاں دیتا ہے میرے سامنے سمیرا اور پنچھا کے رہے ـــ سورج چنار کے درخت کے پیچھے جا چکا تھا ـــ پھر فون کی گھنٹی بجی تو میں نے گھڑی دیکھی پندرہ منٹوں میں تین صدیاں پھلانگ آئی تھی ـــ اچھا ہوا ساحرہ نے خود فون کیا مجھے انکے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا کون جانے کل کیا ہو؟ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ جنکو ہم پسند کرتے ہیں انکے مرنے سے ہماری زندگی کا وہ وقت جو انکے ساتھ گزرا وہ بھی مر جاتا ہے قدسیہ آپا ـــ آپ میرے سامنے زندہ ہیں دیکھئے آپکے بال بچے نہیں تھے تو کیا آپ میرے دل میں زندہ ہیں اور میرا احساس محرومی آپکو کبھی بھولنے نہیں دیگا۔ ساحرہ کالج مقابلے، مشاعرہ، شرارتی اور محفل بگڑ انکی بات اور قدسیہ بیگم میں نے آنسو پونچھے یا رب لوگ کیسے تارے سے بکھر جاتے ہیں۔ بقول سید اللہ بیگم [illegible] موت ہمارے حلقوں میں بھی داخل ہو چکی ہے میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس بھری اور پھر ٹکٹ اور پاسپورٹ کو ایک جگہ رکھتے ہوئے سوچنے لگی ـــ "جانے ساحرہ کو کیا مسئلہ درپیش ہے؟" "کسے معلوم ہے میں آ رہی ہوں سفر سے پہلے مجھے نیند ویسے بھی نہیں آتی اوپر سے ساحرہ نے دماغ کو دھندے سے لگا دیا۔ باہر جاڑے کی شفاف چاندنی میں ٹھنڈ [illegible] رات میں زیادہ خوفناک لگ رہے تھے دور تک سوکھی ٹہنیوں کی قطاریں اور سوکھے پتوں کا ڈھیر ـــ "دنیا کی زندگی کی مثال انکے سامنے بیان کرو جیسے آسمان سے بارش ہوئی ہے پھر سبزہ نکلا ہے پھل اور پھول رنگ برنگے پھر ـــ آخر کار ـــ وہ چورا چورا ہو جاتا ہے جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں" قرآن کہتا کہا میں نے کھڑکی سے اپنے ذہن کے پالے زدہ باغ کو دیکھا کون جانے؟ اگلی بہار تک کون ہوگا؟ اور کون قافلہ حیات سے ـــ نکل جائے گا میں نے کھڑکیوں پہ پردے برابر کئے اور سونے کے لئے لحاف اوڑھتے ہوئے سوچا میں اور ـــ ساحرہ ـــ اور کالج کی سرگرمیاں ـــ

دوسرے دن جہاز میں سوتے جاگتے میں سیالکوٹ کالج کے کوٹھے کی منڈیر پہ بیٹھی سریلی آواز میں اقبال کی غزل گا رہی تھی۔ جو ہم نے یوم اقبال پہ گائی تھی۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ ـــ
قریب تر ہے نمود جسکی اسی کا مشتاق ہے زمانہ ـــ پھر ـــ کالج کے سبزی والے پلاٹ سے مولیاں گاجریں اڑا ـــ مالی کی بکری نے بچے دیئے تھے انکو کوئیں میں لٹکا لا ـــ جانے کہاں کہاں گھومتی رہی ـــ پھر آنکھ اس اعلان سے کھلی کہ جہاز کراچی اترنے والا ہے بیلٹ باندھ لیجئے ـــ کراچی کا موسم سرے کے مقابلہ میں بہت خوب صورت تھا ہفتہ بھر میں شادی سے فارغ ہو کر میں نے ساحرہ کو فون کیا کہ میں فارغ ہوں۔ ساحرہ فوراً آ گئی اور آتے ہی معذرت کی کہ وہ شادی میں بوجہ مجبوری نہ آ سکی اور پھر جلدی سے میرا سامان گا

دیکھوں۔ انکے پیچھے چلتے ہوئے میں نے دیکھا انکے بال کافی ہو گئے تھے بھی لمبے تھے۔
انکو میں نے کئی سال بعد دیکھا تھا باپ اور ماں کا مرکب
خوبصورت لڑکا دبلا پتلا لمبا اب گھر میں بند بند جسم بھاری ہو گیا تھا چہرہ سے
پریشانی نمایاں۔ کبھی کبھی ایک دم محسوس ہوتا کہ وہ ماحول سے بے خبر ہے ساجدہ کا
کہنا تھا کہ آج کل یادداشت بھی کھویا کھویا گم سی رہتی ہے ہم دونوں سے چڑ جاتا ہے
اسکا کمرہ کشادہ تھا دونوں طرف کھڑکیاں تھیں جن کے باہر لوہے کی سلاخیں تھیں
اور جالیاں پھر۔ شیشے کی کھڑکیاں اندر کی طرف۔ ائر کنڈیشنر بھی تھا جو سردی کی
وجہ سے آج کل بند تھا اچھا فرنیچر ایک الماری ایک واش بیسن بھی تھا یہ کمرہ مہمانوں کے
خیال سے بنوایا گیا تھا دو بڑے بڑے بستر تھے۔ ٹی وی دیکھنے سے بھی وہ
خوفزدہ تھا البتہ ایک ریڈیو ایک میز کے نیچے ضرور تھا۔ اس کمرہ کی صفائی ساجدہ
یا انکی بیٹی کرتی تھی میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئی وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا پھر میرے
کہنے سے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کالج کیوں نہیں جاتے وہ ٹال گیا۔ پھر
تھوڑی گفتگو آگے بڑھی تو میں نے کالج کے بارہ میں سوال دہرایا۔ "کوئی فائدہ
نہیں۔ کسی چیز کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے کالج سے نفرت ہے مجھے ظلم سے نفرت
ہے مجھے غنڈہ گردی، تشدد، جبر اور نا انصافی سے نفرت ہے۔ کوئی درندہ اپنی نسل کے
لوگوں کو نہیں کھاتا سوائے انسان کے اسلئے مجھے انسان سے نفرت ہے مجھے اس
شہر سے نفرت ہے" سوچ تعجب ہوا تھا میں نے کہا اگر کسی دوسرے شہر جا کر رہیں
تو پسند کرو گے کالج جانا۔۔۔ وہ بولا کچھ نہیں صرف حیرت سے مجھے دیکھتا
رہا پھر پلک جھپکائے۔

دیکھو اگر ظلم اور نا انصافی تم نے دیکھی اور تم نے اسے روکا نہیں تو تم
بھی اس میں شریک ہو۔ زیادتیاں اور ظلم اسلئے ہوتا ہے کہ لوگوں کے دل سے قا
نون کا احترام ختم ہو جاتا ہے چاہے وہ ملک کا قانون ہو یا اخلاقی اور مذہبی
قانون ہو۔۔۔ کیونکہ قانون ہی ہماری حفاظت کا ضامن ہے۔" نہیں قانون صرف
طاقتور کی حفاظت کا ضامن ہے۔ مجھے قانون سے بھی نفرت ہے۔ ہم جیسوں کو
خودکشی کر لینی چاہئے" یہ تو بہت شکست خوردہ رویہ ہے۔ اور جو ظلم پر چپ رہے وہ
ظالم کا ساتھی ہے یہ تو بھولنا نہیں۔ جانے کیوں اسکا رنگ پیلا پڑ گیا۔ دیر تک وہ
چپ رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد میں نیچے آ گئی۔ شام کو دوبارہ میں اوپر گئی میں انکو
بولنے پر آمادہ کرتی رہی وہ مجھ سے زیادہ چڑ جاتا نہیں جیسے والدین سے چڑ جاتا تھا۔
دوسری شام اسکی اداسی کچھ کم محسوس ہوئی۔ شام کو منظر کے آنے پر
ہم نے کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے بات چیت کی اور اس نے بھی حصہ لیا جو
والدین کی رائے میں واضح فرق تھا۔

میں نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے کچھ لطیفے بھی سنائے اور وہ ہنسا
بھی۔ مگر کئی بار میں نے غور کیا کہ وہ ایک دم سہم کر چپ ہو جاتا۔ مگر وہ ذہنی طور پر
بالکل صحیح انسان لگا اور میں سمجھتی ہوں تھوڑی کوشش سے وہ تھوڑے دنوں میں ہی
زندگی کے دھارے میں شامل ہو سکتا تھا۔

مجھے یہاں آئے کئی دن ہو گئے تھے وہ اب مجھ سے کافی مانوس ہو گیا
تھا۔ اس دن منظر دیانی کی چھٹی تھی ناشتے کے بعد ساجدہ نے پوچھا اگر تم انکی
دیکھ بھال کر سکو تو ہم دونوں شاپنگ کر آئیں؟۔ گزشتہ دو سال سے ہم اکٹھے گھر
نہیں چھوڑ سکے ویسے نارمل ہی ہے انکے جانے کے بعد میں نے طاہر سے کہا آؤ
ذرا لان میں ٹہلتے ہیں۔ نہیں نہیں کہتا ہوا وہ بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف آیا اور
بڑی تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھ گیا جب تک میں سیڑھیوں تک پہنچوں وہ دوسری
منزل تک پہنچ گیا تھا میں حیران رہ گئی۔ میں نے سانس درست کی پھر اوپر جا کر
پوچھا۔ "بیٹے کیا بات ہے؟۔۔۔ کہنے لگا وہ آ جائیں گے۔ وہ۔۔ وہ آپکو
نہیں چھوڑیں گے۔ اوپر جا کر وہ دھم سے بستر پر گر گیا۔ میں نے پریشانی سے پوچھا
طبیعت کیسی ہے؟ کہنے لگا چکر آ رہا ہے میں وہیں بیٹھی رہی پھر محسوس ہوا کہ
وہ سو گیا ہے تو میں نیچے آ گئی۔

ساجدہ اور منظر کے آنے پر میں نے انہیں رپورٹ دیتے ہوئے
تجویز پیش کی کہ کسی طرح انکو لاہور لے چلیں ممکن ہے ماحول بدلنے سے کچھ
گتھیاں کھل جائیں۔ ہو سکتا ہے وہ نانی نانا کے گھر رہنے پر راضی ہو جائے تو پھر
کالج میں داخلے کے لئے بھی سوچا جا سکتا ہے۔

"میں کل آفس میں ایک دو ہفتے کی چھٹی کی بات کروں گا ایک ہفتہ
لاہور رہ کر۔۔۔ اگر حالات سازگار ہوئے تو پھر سب اکٹھے سوات وغیرہ چلیں
گے ورنہ جو اللہ کی مرضی میں تو" اسکا گلا رندھ گیا ناشتے کے بعد میں نے طاہر
سے پوچھا۔ "طاہر میں لاہور اسلام آباد جانا چاہ رہی ہوں کیا تم مجھے لے
چلو گے؟ وہ بے اختیاری سے مجھے دیکھنے لگا۔ کیوں۔ بھی تمہیں کراچی سے نفرت
ہے ۔ا باہر جانے میں کیا قباحت ہے؟ ویسے بھی تم اکیلے کیسے رہو گے؟ ساجدہ
بیچاری دو سال سے تمہاری وجہ سے قید ہے " مگر ائیر پورٹ پر جانا مسئلہ ہے اس
نے بڑی سنجیدگی اور فکرمندی سے کہا۔

ہم رات کی فلائٹ سے چلیں گے گاڑی اندر آ جائے گی تم لمبا
کوٹ پہن کر مفلر لپیٹ کر بیٹھ جانا کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ تم کون ہو۔ وہ تھوڑا
سا مسکرایا پھر ایکدم سنجیدہ ہو گیا۔ یہ بہت مشکل ہے مگر۔۔۔ میں یہاں اکیلے بھی
تو نہیں رہ سکتا۔۔ اصل میں تو۔ بس یہ سمجھو کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے
میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میں تو صدیوں سے باہر نہیں نکلا مجھے ڈر
لگے گا" یہ طے ہے کیا کہ تمہیں خطرہ کراچی میں ہے کراچی سے تو بہت دور
تمہیں کون جانتا ہے؟ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے کہا۔۔۔ "میں اس پر
غور کروں گا"

اس تمام دن وہ خاموش رہا۔ مجھے پریشانی ہوئی کہ کہیں مجھ سے خفا تو
نہیں ہو گیا جو کہ نیک شگون نہیں ہو گا۔ میں نے اوپر جا کر پوچھا تو معلوم ہوا وہ
تمام دن سوتا رہا ہے۔ کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی شام کو کھانا کھانے کے لئے نیچے
آیا سب لوگ باری باری چلے گئے تو اس نے کہا۔۔۔ "خالہ کیا آپ فارغ ہیں؟
میں نے کہا ہاں بالکل۔۔۔ "اگر میں آپ سے کسی کے بارہ
میں کوئی سوال کروں تو کیا یہ بہت بری بات ہوگی؟" میں نے کہا تم نے اس سے

آ کر آہستہ سے کہا۔۔۔ باجی اللہ کے کام پہ کچھ دے دو۔ میں نے کہا اتنے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہو اور بھیک مانگ رہی ہو کام کیوں نہیں کرتیں۔ باجی مجھے کون کام دیتا پہلے اسی کا گزارہ ہو جاتا تھا اب ٹی۔وی کی خبروں نے ہماری روزی چھین لی آپ بتائیں ہمیں کون کام دے سکتا؟ اسکی سوئی آواز سے میں چونکی میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بے پناہ رحم کا ایک جذبہ میرے دل میں موج کی صورت میں اٹھا میں نے تھیلا اٹھائی ۔۔۔ تو کچھ سکے قریب قریب نظر آئے۔ میں نے پرس میں ہاتھ ڈالا جو اسکے نصیب کا تھا دیا اور کہا کہ اس میں سے چاروں بانٹ لینا اس نے کہا جی۔۔۔ خالہ جی۔ اس طرح سے تو آپ کنگال ہو جائیں گی۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھی کاش اس مخلوق کے حقوق اور مستقبل کے لئے کچھ کیا جا سکتا۔

شاید میں طاہر کے قصے کی وجہ سے زیادہ جذباتی ہو رہی تھی میرا دل شاپنگ سے بالکل اچاٹ ہو گیا، دنیا اور اسکے حالات سے مجھے نفرت محسوس ہوئی، آخر ان کی فلاح بہبود اور حقوق کے لئے کیوں نہیں سوچا گیا؟ پھر دماغ کی میرے خیال میں آئی جسکے ساتھ کاؤنسلر نے اجتماعی زیادتی (آبروریزی کی تھی) اور پنچایت کا فیصلہ تھا جس قوم کے بزرگ ایسے بے غیرت ہوں کہ ایسے حرام اور ظلم کو قانون بناتے ہوں وہاں۔ حق نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہو سکتی پھر ریکارڈ واحد واقعہ تو ہے نہیں ہر تیسرے دن ایسے واقعات ہوتے ہیں کسی کا ضمیر ملامت نہیں کرتا۔ یہ بچارے تو مجبور انسان ہیں۔ یا انھیں انسان ہیں۔ پھر اس معاشرہ کا بزرگ یہودیوں کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم ہیں اسلئے جو چاہیں کریں بچارہ طاہر اس سے کسی نے نیکی کا بدلہ آج یہودیوں نے دنیا کو باز کی طرح اپنے پنجے میں دبوچا ہوا ہے شکار کے زخم سے جو خون رس رہا ہے یہ خون ہمارا ہے اور ہمیں اجتماعی بدکاری کو قانون بنانے سے فرصت نہیں مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ابھی الٹی آجائے گی۔ میں نے فوراً ٹیکسی پکڑی اور گھر آ گئی۔ اس دن مجھ سے کھانا نہیں کھایا گیا۔

رات کو میرے ذہن میں منظر کا دعا کے جملہ بار بار آتا رہا یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہوگی۔ کیونکہ The sins of fathers arevisited by their sons مگر میں یقین کرنے کو تیار نہیں کیونکہ میرے دماغ میں ایک آیت بار بار آ رہی تھی۔۔۔۔ "جس نے بھلائی کی اسے اسکا دس گنا ملیگا۔ اور جس نے برائی کی اسے اتنا ہی ملے گا" (سورہ انعام آیہ نمبر ۱۶۰) صحیح بخاری کتاب طلاق باب ۱۲، کے مطابق سوگنا تک مل سکتا ہے نہیں دیا نہیں ہو سکتا۔ منظر کا بیٹا نہیں۔ میں نے آسمان کی طرف ایسے دیکھا جیسے مجھے جواب ملیگا۔ یا اللہ تعالیٰ مجھے نظر آ جائے گا۔

رات کو کھانے پہ منظر نے بتایا کہ اسکی چھٹی بھی منظور ہو گئی ہے اور لاہور کے ٹکٹ بھی بک ہو گئے۔ طاہر کے چہرے پہ پریشانی کے سائے لہرا گئے میرا خیال ہے تمہیں اچھا لگیگا ہم پرانی جگہیں دیکھیں گے سارے یار طاہر کے کاندھے پہ تھپتھپا کر کہا پھر منظر نے طاہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا like old times,remember? اس نے بیٹے سے کہا جو پریشان نظر آ رہا تھا۔

مجھے باپ بیٹے کا یہ ذہنی ہم آہنگی اور محبت کا اظہار اسکے اشارے کی سعادت کے لئے پسند آیا۔ دوسرے دن رات کے گیارہ بجے کے بعد ہم سب لاہور کے لئے روانہ ہو گئے طاہر نے واقعی لمبا کوٹ پہنا مفلر لپیٹا اور گھر سے کو لپیٹ کر ٹکا اور ہم میں سے کسی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا سب ائیر پورٹ پہ اپنے اپنے دھیان تھے۔ گھر کے لئے گئے سامان وغیرہ کی ذمہ داری سائرہ نے لی۔ ڈاکٹر نے کوئی گولی بھی دے دی تھی کہ وہ سوتا رہے۔

ہم لاہور صبح پہنچے منظر نے بیٹے کو سنبھالا وہ نیند میں بے ہوش تھا پھر ہم باہر آ گئے جہاں سائرہ کے بھائی جان گاڑی لئے کھڑے تھے۔ رات کو طاہر اپنی نانی کے کمرے میں سویا۔ صبح ناشتے پہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا کھانے کی میز سے یکدم اٹھ گیا کہ مجھے نیند آ رہی ہے میں نانی کے کمرہ میں جا رہا ہوں اور پھر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح ناشتے کے بعد سائرہ اور منظر باہر کسی کام سے چلے گئے طاہر دو بجے دن سو کر اٹھا شور ہوا گیا جاس نے بیدلی سے کیا۔ اس کا موڈ خاصا خراب اور بانتا نانی آکر بڑے پیار سے جتنیں یاد کیا بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایک ٹک باہر دیکھتا رہا۔ میں نے پوچھا ٹی۔وی لگاؤں۔ جواب ملا نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ جلے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "خالہ جی مجھے نفرت ہے ٹی۔وی سے" ہم نے کہا کیوں؟ ۔۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگا ٹی۔وی دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ پاکستان میں یا تو سیاستدان رہتے ہیں جو بیکار ترین مخلوق ہیں اور جا بجا بحث کرتے ہیں نئی نسل کو دینے کے لئے انکے پاس کچھ نہیں ہے کچھ ہیں نہ خود کبھی کوئی مفید کام کیا نہ نئی نسل کو آگے بڑھنے دیا کہ وہ خود کوئی تجربہ کریں ٹی وی سکرین کی وہ جان چھوڑتے ہیں تو اور پھر دوسرا وہ جنھیں بتحد کر سکتی ہیں، دونوں میں میں بڑی مشابہت ہے پہلا اور پھر یا وہ جنھیں جو چند اشیاء سے مختلف چیزیں تیار کر سکتی ہیں یا مطلوب تیار کر سکتی ہیں چاہے ملک کے ٹوٹنے یا فیصلہ کرنے کی وجہ ہو یا پھر یا وہ جنھیں مرغی اور انڈے اور دوست سے نیچے بات نہیں کریں گے۔ سیاستدان عوام کی جہالت سے اقتدار کا مطلوب تیار کرتے ہیں۔ یہ بھی ٹی وی سکرین پہ داڑھی والے ملا اسی انداز میں موجود مختلف عقیدوں کے مطلوبوں کی کتابوں سے فتوے کا مربہ تیار کرتے ہیں اور ایک ہی عقیدے پہ ہوتے ہوئے بھی متضاد فتوے دیتے ہیں وہ یہ دعا میں بتاتے نہیں بھولتے کہ عورتوں کو مارنا ضروری ہے ورنہ اسلام خطرے میں ہو جائے گا اور حضرت عائشہ۔۔۔ تجربے چھوڑ دیجئے۔۔۔ یہ ہماری اسلامی قابلیت کا لب لباب ہے آج کے انسانوں کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ جن سوالات کی اذیت سے دوچار ہیں۔

وہ جدید جا کے لئے کیسے ضمیر فروشی پہ مجبور ہیں ان کے لئے انہوں نے کبھی کوئی تحقیقی یا فکر کا ثبوت نہیں دیا؟ یا تو یہ لوگ خود عقل سے پیدل ہیں یا پوری قوم کو گدھا سمجھتے ہیں۔ اور میں ان گدھوں میں نہیں ہوں شکریہ۔ وہ

مکڑیاں اور چوہے

شمشاد احمد

(کراچی)

اچانک دماغ کی نچلی سطح پر ایک ٹیڑھی ٹانگوں والی بدصورت مکڑی ابھری، پھڑپھڑائی اور غائب ہو گئی۔ جو اپنے پیچھے ایک بدمزہ مکروہ سرسراہٹ چھوڑ گئی۔

میں نے قہقہہ لگایا۔

"کیا کیسے ہو سکتا ہے ـــــ ناممکن ـــــ"

بدمزہ سرسراہٹ ہلکی پڑ گئی اور پھر ختم ہو گئی۔

میں نے اپنی فتح پر ایک اور قہقہہ لگانے کا سوچا لیکن ایک تیز طرار چوہا بڑے اطمینان سے پھدکتا ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا۔ وہاں دم بھر کو رکا، مڑ کر مجھ پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھینکی اور چلتا بنا۔

میری رگ رگ میں ایک انتہائی بدبودار جھلاہٹ دوڑنے لگی۔

قہقہہ اندر ہی کہیں کسمسا کر رہ گیا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل پڑا۔ مکڑیوں اور چوہوں کا آنا جانا لگ گیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے میرے اندر مستقل ڈیرے ڈال دیئے۔

میں ایک ڈراؤنے خواب میں جینے مرنے لگا۔

"میں ـ میں درندوں کی طرح اپنے جیسے انسانوں کو چیروں پھاڑوں گا۔ خوبصورت جسموں کے چیتھڑے اڑاؤں گا۔ رحم ـــــ یا اللہ رحم ـــــ"

میں نے عمر کے کسی حصے میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی کسی کی جان لینے کا نہیں سوچا۔ ساری عمر لکھنے پڑھنے میں اور خوبصورت خواب دیکھنے میں گزری ہے اور اب اس آخری عمر میں یہ عذاب!

"عیش کرو۔ تمہارے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار۔ ہر طرف خون اور لاشیں۔ پہلے کیا کم ہیں؟"

دم بھر کو جنون سست پڑتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے مزید گھن گرج کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے اور مجھے تہس نہس کر ڈالتا ہے۔

میں اپنے سلگتے بدن پر ٹھنڈے چھینٹے مارتا ہوں۔

"کسی سے دشمنی ہو۔ کسی نے نقصان پہنچایا ہو، حق تلفی کی ہو۔ چلو آدمی اس کی جان لے لے۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی کرے لیکن بلاوجہ بغیر جان پہچان کے کسی کا قتل۔ انسانیت کا قتل ـــــ"

میں پاگل ہو گیا ہوں۔ پاگل ہو چکا ہوں۔ میرے اندر کسی شکاری کا بھوت گھس گیا ہے۔ مجھے فوری طور پر کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔ لیکن ـــــ لیکن اگر وہ ماہر نفسیات بھی میرے والے مرض میں مبتلا ہوا تو ـــــ

اپنی زندگی بھر کی ساتھی ہوتی تو اسے اپنا حال سناتا۔ شاید اس گندے بخار میں کچھ کمی آ جاتی۔

یہ سب میرے بوڑھے اعصاب کی جھنجھلاہٹ تو نہیں؟ لیکن نوجوان بچے تک۔ کیا ہر کوئی وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔

میں اس وحشی جذبے کے سامنے بڑے بڑے پتھروں کے بند باندھتا رہتا ہوں۔ لیکن پتھر ریت ہو جاتے ہیں اور سرخ آندھی انہیں اڑا لے جاتی ہے۔

ایک طویل عرصے سے گلیوں، بازاروں میں، عبادت گاہوں میں ـــــ ہر طرف خون اور لاشیں ـــــ گھروں سے روٹی کی خوشبو کی بجائے آہوں اور سسکیوں کا کڑوا دھواں اٹھ رہا ہے۔

بے حسی ہمیں اندر سے اندر سے چاٹتی رہی۔ ہمیں احساس تک نہ ہوا۔ پھر اس کی کوکھ پھٹی تو اس میں سے ہزاروں لاکھوں مکڑیاں اور چوہے بلبلاتے ہوئے نکلے اور ہر سو پھیل گئے۔

میں سوچنے پر مجبور کیوں ہوں؟ میرے خدا مجھے پتھر کر دے۔

خدا میری مدد کو نہ آیا۔ شیطان نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

میں سب سے بڑا اور سب سے تباہ کن ہتھیار ڈھونڈنا چاہتا تھا کہ لمحوں میں لاکھوں کے پشتے لگ جائیں۔ میری مکڑیاں اور چوہے مطمئن ہو جائیں۔ میرا گندا بخار اتر جائے۔

ہتھیار کہاں ملتے ہیں؟ کیسے خریدے جاتے ہیں؟

اب یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جاننے والوں سے پوچھا جائے۔ کسی غلط شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی تو ایک نیا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ہمیشہ کے لیے کسی گمنام عقوبت خانے میں زندہ موت ـــــ

"چاقو۔ لمبے پھل والا تیز دھار چاقو۔ آسانی سے مل جائے گا"

"چاقو سے کتنے آدمی مارو گے؟ دو چار دس بیس مریں گے۔"

میں سر سے پاؤں تک شرم سے تر بتر ہو گیا۔

پستول مناسب رہے گا۔ پستول کہاں ملے گا؟

چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، گلیوں، سڑکوں پر غور کرتا رہا۔ کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ مایوس ہو کر طوعاً و کرہاً چھری پر اکتفا کرنے کا طے کرنا پڑا۔

گھر سے تھوڑے فاصلے پر بستی کے بازار میں ایک دکان تھی۔

وہاں سے لوگ بالک مہد قرباں پر چھریاں خریدتے اور تیز کرواتے تھے۔ میں
وہاں پہنچ گیا۔

دکاندار ایک چمکتی ہوئی چھری انگوٹھے کے ناخن پر پھیر پھیر کر اس کی
دھار جانچ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے چھری ایک طرف رکھ دی۔

"آیئے آیئے۔ کچھ تیز کروانا ہے یا......"

لکڑی کی لمبی بینچ پر چھوٹی بڑی چھریاں، چاقو ترتیب سے سجے تھے۔

دکاندار اپنی بھوری آنکھیں سکیڑ کر میرا جائزہ لے رہا تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے اندر اتر گیا ہے اور سب کچھ جان گیا
ہے۔

وہ میرے کان پر جھک گیا۔

"یہاں ہر چیز ملتی ہے بغیر کسی تفتیش کے اپنی ضرورت بتایئے۔"

میں نے چھری جیسے گھٹیا ہتھیار کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن دکاندار کو
اپنا فیصلہ سنانے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔

دکاندار نے ایک ہلکا قہقہہ لگایا۔

"خودکش حملے کا جیکٹ، مکمل تیار...... اسٹیل کی گولیوں اور
کیلوں سے لدا......"

میں جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور گرتے گرتے بچا۔

دکاندار نے مجھے لپک کر سنبھال لیا۔

اس نے میری بزدلی کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس نے پینترا بدلا۔

"آپ فی الحال چھری ہی لے لیں۔"

اس نے ڈسپلے کرتی چھریوں کی طرف انگلی اٹھائی۔

"پسند کر لیں۔"

میرے پاؤں زمین میں گڑ سے گئے دیکھ کر وہ آگے بڑھا اور ایک فٹ
بھر لمبی چھری اٹھا کر میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

"منٹوں میں گلے کے پٹھے کاٹ دے گی۔"

میرے تذبذب نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ شاید میرے جیسے
بزدل گاہکوں کا عادی نہ تھا۔

اس نے ایک اچھے دکاندار کی طرح چھپا گُر آزمایا۔

"خودکش جیکٹ آپ کے لیے بڑا ہے، چھری آپ کی خواہش سے
چھوٹی ہے۔ ایک درمیانی چیز میرے پاس ہے آپ کو یقیناً پسند آئے گی۔"

وہ اپنی تاریک سرنگ دکان میں غائب ہو گیا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔

اس نے پستول کو اپنی شلوار پر رگڑا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میرے جسم کا دھاگہ دھاگہ تھرتھرا رہا تھا۔

میں نے پستول پکڑنے سے پہلے بازار کا جائزہ لیا۔ ہر طرف
چہل پہل تھی۔ معمول کا لین دین جاری تھا۔ گاڑیاں، بانس ہتھی ہجوم کو دھکا
کر راستہ بنا رہی تھیں۔ گوشت کی دکانوں کے سامنے چیلیں غوطے لگا رہی
تھیں۔

میں خوامخواہ پریشان تھا۔ ہر کوئی اپنے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی کے
پاس مجھے دیکھنے جانے کا وقت نہ تھا۔

دکاندار نے مجھے مطمئن دیکھ کر قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر
بزرگانہ تھپکی دی۔

"ہم سب ایک ہیں، کوئی غیر نہیں ہے۔"

میں بھاؤ تاؤ کیا کرتا۔ اس نے جو مانگا دے دیا۔

میں چلا تو اس نے سرگوشی کی۔

"آتے جاتے رہیے، دکان آپ کی ہے۔"

میں خاص طور پر لمبا کرتا پہن کر آیا تھا۔ میں نے پستول نیفے میں
اڑس لیا۔

پستول ٹھنڈا تھا۔ میرے گرم جسم نے احتجاج کیا۔ میں نے اسے
کھینچ کر کرتے اور بنیان کے بیچ میں رکھا اور دبا لیا۔

میرا فوری طور پر کارروائی کا ارادہ نہ تھا۔ موقع محل دیکھنا، جانچنا
ضروری تھا۔

اچانک پستول بنیان اور کرتے کے بیچ اچھلنے لگا۔ پستول زندہ تھا!

سورج ڈھل کر بلند و بالا عمارتوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ بازار میں
چلتے پھرتے آتے جاتے انسان زرد، مردہ روشنی میں سایہ ہو کر رہ گئے تھے۔

اگر گلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہو کر ایک میگزین خالی کر دیا جائے تو
ایک کثیر تعداد مرنے اور زخمی ہونے کے روشن امکانات تھے۔

کھمبے کے دائیں طرف گندی گلی تھی۔ تنگ، گندی گلیاں اچھی پناہ
گاہیں ثابت ہوتی ہیں۔ ادھر سے بچ کر نکل جانا آسان ہوگا۔

میرا ہاتھ نیفے کے نیچے پہنچا۔ پستول دہکنے لگا تھا۔

میں کھمبے کے پیچھے ہو گیا اور پستول نکال کر تان لیا۔

میرے بالکل سامنے گھنی مزار کے بیچ ایک چھ سات سال کی بچی
اپنی سرخ زبان باہر نکال کر آئس کون چاٹ رہی تھی۔ اس کے بالوں میں الجھا سرخ
رنگ کا ربن گرم ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

بچی بہت پیاری تھی۔ میں نے اسے نشانہ بنایا۔

عین اسی وقت اس کی ماں سبزی کا تھیلا لئے اس کی طرف لپکی۔

میں اندر ہی اندر تلملا اٹھا۔

باقی: صفحہ نمبر 86 پر

جشنِ زندگی

فیروز عالم (یو ایس اے)

موسم بہار کی ڈھلتی شام کا وقت تھا۔
میرے سامنے شمال کی جانب کیلیفورنیا کے بلند و بالا پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں اب بھی برف سے ڈھکی تھیں اور ان پر ڈوبتے سورج کی کرنوں نے سنہرا اجالا سا بکھیر دیا تھا۔ ایک بل کھاتی سڑک سے موڑ کاٹتے ہوئے میں نے اس کے گھر کے سامنے اپنی ٹو سیٹر اسپورٹس کار پارک کی۔ یہ ایک چھوٹا سا ہسپانوی طرز کا کاٹیج تھا جس کا محراب دار برآمدہ بوگن ولا کی کاسنی پھولوں کی لدی بیل سے ڈھکا تھا۔ صدر دروازے تک چند سیڑھیاں تھیں جو سرخ اینٹوں کے ہشت پہلو ٹکڑوں سے مزین تھی۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اپنے مریضوں سے صرف پیشہ ورانہ تعلق رکھتا ہوں۔ ان کے لئے میں بہت ہی فکرمند بھی اور انتہائی ہمدردانہ احساسات بھی رکھتا ہوں مگر میں نے کبھی ان سے کسی قسم کے سوشل تعلقات نہیں رکھے تھے۔ مجھے ایسے دعوت نامے پہلے بھی کئی دفعہ ملے تھے مگر "کنسوئیلو" نے کچھ اس انداز سے اصرار کیا تھا کہ میں مجبور ہو گیا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کی یہ خواہش کہ میں ایک شام اس کے ساتھ چائے پیوں ٹھیک طرح رد نہ کر سکا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ آج جب کہ میں خوش قسمتی سے اپنی جاب سے فارغ تھا میں نے سوچا کہ یہ وعدہ پورا کر ہی دوں۔

اس کی ہدایت کے مطابق میں ایک چھوٹی سی روش سے ہوتا ہوا بغلی دروازے سے اس کے پائیں باغ میں داخل ہوا۔ وہ سرسبز لان کے آخر میں ایک کونے میں بنے گزیبو میں بیٹھی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھی اور میرا استقبال کیا۔ اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ بکھر گئی اور اس نے اپنے کمزور اور کسی قدر دبلے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام کر کہا "بڑی خوشی ہے کہ تم آ گئے۔" میں نے کہا "مسز سائیجر تم نے اصرار ہی اتنا کیا تھا کہ میں انکار نہیں کر سکا۔" اس نے اپنے خاص انداز سے انگلی ہلا کر کہا "نو نو، صرف کنسوئیلو۔ میرا نام کنسوئیلو ہے۔" اس کے قریب ہی کھڑی خادمہ نے اس سے ہسپانوی میں کچھ کہا تو اس نے چائے لگانے کی اجازت چاہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے نیلا نیلوں سے بنا ہوا پول تھا جس کے ایک کونے سے پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ شام کی روشنی تیزی سے سرمئی اندھیرے میں بدل رہی تھی اور روشوں کے کنارے لگی مالیبو (MALIBU) لائٹس جل اٹھی تھیں۔

کنسوئیلو سائیجر کو میں نے پہلی دفعہ کوئی چار ماہ پہلے اپنے کلینک میں دیکھا تھا۔ وہ نوے سال کی ایک بظاہر تندرست اور خوش مزاج ہسپانوی نژاد خاتون تھی۔ اسے میرے پاس اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کے جنرل ڈاکٹر کو اس بات کا شبہ تھا کہ اس کے گردے صحیح کام نہیں کر رہے۔ میری یہ ذمہ داری تھی کہ میں مکمل طور پر اس کے ٹیسٹ اور معائنہ کر کے اس بات کا تعین کروں کہ آیا یہ شبہ صحیح ہے اور اگر صحیح ہے تو اس کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی نواسی جو بتیس سال کی تھی کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی نواسی کو اس پورے معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ پورے معائنے کے دوران مستقل چیونگ گم چباتی رہی اور وقفے وقفے سے ہونٹوں پر چیونگ گم کے غبارے بنا کر پھوڑتی رہی۔ آخر کار میں نے کچھ سکون اور توجہ کے لئے کنسوئیلو سے اجازت لے کر اس سے کہا کہ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھے۔ اس پر اس نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور گردن کو ایک جھٹکا دے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے پوچھنے پر کنسوئیلو نے بتایا کہ اسے تو کوئی تکلیف نہیں مگر اس کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں اس کی طرف سے بہت تشویش میں مبتلا ہیں اس لئے وہ ان کی ضد پوری کرنے آئی ہے۔ میں نے اس کا معائنہ کیا وہ حیرت انگیز حد تک اچھی صحت میں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے تمام متعلقہ ٹیسٹ آرڈر کر دئیے۔ وہ بے حد خوش مزاج، مثبت سوچ رکھنے والی اور پیاری فطرت کی عورت تھی۔ میری گفتگو کے درمیان وہ کسی نہ کسی طرح مزاح کا پہلو نکال لیتی تھی۔ اگرچہ وہ کیلیفورنیا ہی میں پیدا ہوئی تھی مگر اس کے لہجے میں ہسپانوی انداز نمایاں تھا اور وہ "ٹ" ادا نہیں کر سکتی تھی اس لئے اس کا انداز گفتگو مجھے بہت دلچسپ لگا۔

دو ہفتے بعد وہ پھر مجھے دکھانے آئی۔ ٹیسٹوں کے نتائج آ چکے تھے۔
کوئی خاص تشویش کی بات نہیں تھی۔ سب ہی زیادہ تر ٹیسٹ حیرت انگیز طور پر ٹھیک اور نارمل تھے۔ گردے کا فعل بھی کوئی معیاری نہیں تھا۔ اس کے گردے تقریباً تیس فیصد کام کر رہے تھے۔ اس وجہ سے زندگی کو فوری کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بس غذا اور دواؤں میں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ گردے کا کام رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چند سالوں میں گردے مکمل طور پر کام کرنا چھوڑ دیں گے اور زندہ رہنے کے لئے اسے ڈائیلیسس کا سہارا لینا پڑے گا۔ مگر ایک تو یہ کہ وہ پہلے ہی نوے سال کی تھی اور ابھی اس کے گردے کئی سال کام کر سکتے تھے۔ دوسرے اگر ڈائیلیسس کرنی ہی پڑی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ آج کل امریکہ میں یہ طریقہ علاج اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ ڈائیلیسس پر بیس تیس سال تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔ اس لئے میں اس سلسلے میں بالکل فکرمند نہ تھا۔ وہ بھی مسکرا کر سنتی رہی کہ مجھے کوئی فکر نہیں ہے اور یہ کہ مجھے ڈاکٹروں کے پاس آنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس پر میں نے ہنس کر کہا کہ مسز سائیجر اب تو تمہیں میرے پاس ہر چھ مہینے بعد آنا ہی پڑے گا۔ اس نے اپنی انگلی گھما کر کہا "کنسوئیلو، میرا نام کنسوئیلو ہے۔ سائیجر تو میرے شوہر کا نام تھا وہ تو مجھے پندرہ سال پہلے دغا دے گیا۔" میں نے پوچھا "کیسی دغا؟؟" کہنے لگی "ہم نے ایک ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دے کر مرنے کی قسم کھائی تھی مگر وہ پہلے ہی کھسک گیا۔ دھوکے باز۔ خیر میں بھی وہاں جا کر اس کی خوب خبر لوں گی۔" میرے پاس کھڑی نرس نے بے ساختہ کہا "لیکن ہم تمہیں اتنی جلدی وہاں نہیں

جائنگی۔ ڈاکٹر میں نے ایک بہت دلکش زندگی گذاری ہے جسکی دلکشی باقی ہے میں اسکے آخری منظر کو بھی دلکش رکھنا چاہتی ہوں۔ میں زندگی کے قدرتی انجام کو مسکراتے ہوئے اور خوش دلی سے قبول کرنا چاہتی ہوں۔ موت تو زندگی ہی کا ایک حصہ ہے۔ زندگی نے مجھے کیا نہیں دیا۔ میں نے چاندنی راتوں میں بحرِکاہل کے ساحل پر پیٹر وین کے ساتھ ننگے پاؤں گھنٹوں چہل قدمی کی ہے اور اپنے پیروں تلے دودھیا ریت کی ٹھنڈک محسوس کی ہے۔ موسمِ سرما میں پہاڑی جھیل کے کنارے بنے کاٹیج کی کھڑکی سے ٹنڈ منڈ درختوں پر برف کے گالے گرتے دیکھے ہیں اور ریگستانوں میں کھلے آسمان کے نیچے کیمپنگ کی ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو ڈگمگاتے پیروں سے پہلا قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا ہے اور انکی توتلی زبان سے ماما ماما کہتے ہوئے سنا ہے۔ یہ سب قدرت کی نوازشیں تھیں۔ کیا میں اب قدرت کو اس بات کا تاثر دوں گی کہ میں زندگی کے معاملے میں لالچی ہو گئی ہوں۔ کیا میرا دل اس دنیا سے کبھی بھی نہیں بھرے گا۔ میں اپنے آپ سے، اپنی زندگی سے بے حد اور بہت خوش اور مطمئن ہوں بالکہ میں اس سے بالکل سیر ہو چکی ہوں۔ اب میرا ارادہ ہے تو میں اس پر لبیک کہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میرا سوگ نہیں میری زندگی کا جشن منایا جائے۔ پھول کے مرجھا جانے کے بعد بھی کچھ دیر اسکی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے سورج ڈوبنے کے بعد بھی افق پر ایک ہالہ کی سی باقی رہتی ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں میرے بعد میرے بچے میری پر مسرت زندگی کی گرمی اور حدت محسوس کریں اس لئے کہ میں مروں گی نہیں بالکہ یوں سمجھو ایک لمبے سفر کے بعد سمندر کے اس پار ایک دوسرے ساحل پر اتر جاؤں گی" میں اسے ڈایالیسس کے لئے کسی طور قائل نہیں کر سکا۔ ایک عجیب بوجھل سا دل لئے گھر آیا۔ رات کو عجب بےچینی رہی۔ ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے تھے۔ اسکا پیارا مسکراتا چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا کیا یہ خودکشی نہیں؟؟ یہ خوبصورت چہرہ یہ روشن سیاہ آنکھیں چند دنوں میں خاک میں مل جائنگی۔ پھر میرا دل یہ پوچھتا تھا کہ کیا کسی انسان کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ اپنے آخری سفر کو اپنے اصولوں کے تحت طے کرے۔ اسکا یہ کہنا صحیح تھا کہ ڈایالیسس کے نظم الاوقات سے اسکی زندگی درہم برہم ہو جائیگی۔ وہ ایک میرا آنا اور سے گزرے گی اور زندگی صرف سانس کی آمدورفت کی حد تک جاری رہیگی اور ایک طرح یہ زندگی کو طول دینا نہیں بالکہ موت کے مرحلے کو طول دینا ہوگا۔ وہ اپنے فیصلے سے قلبی طور پر مطمئن ہے۔ اسے اپنے فیصلہ کرنے کا حق ہے اور مجھے اسکا طبیب ہونے کے ناطے اسکا مکمل ساتھ دینا چاہئے۔ پھر اسکے کنبے کے ساتھ کئی ملاقاتوں میں یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اسکا کنبہ بھی اس فیصلے میں اسکے ساتھ تھا۔ وہ اس بات پر تیار تھی کہ ڈایالیسس کے علاوہ جو بھی علاج کیا جا سکتا ہے وہ ضرور کروں۔ میں صرف یہ کرتا رہا کہ وقت ضرورت اسے خون چڑھاتا رہا، اسکی غذا اور تقویت کو بحال رکھا اور چھوٹے موٹے مسئلوں میں اسکو وقتی طور پر سہارا دیتا رہا۔ اب وہ اسقدر کمزور ہو گئی تھی کہ وہ میری کلنک نہیں آتی تھی میں ہی اسکے گھر چلا جاتا تھا جب اس سے ملنے جاتا وہ اپنے پھولوں کے پاس پہیوں والی کرسی پر ہوتی اور اپنی خادمہ سے بڑی توجہ سے پودوں کی آرائش کروا رہی ہوتی۔ ہمیشہ میرا استقبال بہت گرمجوشی اور دلفریب مسکراہٹ سے کرتی اور کسی نہ کسی طور پر مجھے جتلانے کی کوشش ضرور کرتی۔ وہ کہتی "زندگی ایک کارنیوال ہے اور اسے ہنستے کھیلتے گزارنا چاہئے میں اس سے مسرت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لونگی" اس کے لواحقین اس کے سامنے ایک بارونق میلہ سا لگائے رکھتے۔ اسکے پوتا پوتی اور ننھا سا نواسہ اس کے لئے نجانے کیا کیا لاتے اور اسکے پاس ہی فرش پر کھیل رہے ہوتے۔ اسکے بیٹے سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ کر گٹار بجاتے۔ کبھی کبھی وہ اس کے قریب ایک پرانے ریکارڈ پلیئر رکھ دیتے اور اس کی جوانی کے زمانے کے ہسپانوی ریکارڈ بجا کر اسکا دل خوش کرتے۔ موسیقی کی تان پر کبھی وہ خود بھی اٹھ کر ناچنا شروع کر دیتی مگر پھر جلد ہی تھک کر بیٹھ جاتی۔ ایسے میں اس کے چہرے پر ایک بھرپور طمانیت کا نور ہوتا۔ وہ آخر تک پرسکون رہی اور نرسوں کی اس ٹیم نے جو مرگ کے ایسے مریضوں پر مقرر کی جاتی ہے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ وہ بہت آرام سے رہے اور کسی تکلیف سے نہ گزرے۔ موسمِ سرما کی ایک ٹھنڈی صبح اسپتال سے نرس نے مجھے کال کر کے بتایا کہ وہ رات نیند میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔ نرس کی ہدایت پر میں نے اسکی موت کے تصدیق نامے پر دستخط کر دئے۔

جب میں اسکی آخری رسومات میں گیا تو چرچ کے بڑے ہال میں اسکے تابوت کے چاروں طرف اس قدر پھول تھے کہ سارا اسٹیج اس سے بھر گیا تھا۔ دونوں طرف ایستادہ موم بتیاں روشن تھیں اور ہال ایک بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ چرچ کی اونچی کھڑکی سے جس میں رنگین شیشے لگے تھے سورج کی ایک شعاع نے کمیں اس کے تابوت پر منعکس ہو کر اسے جیسے نور کے ہالے میں لے لیا تھا۔ لوگ اپنے بہترین لباس میں ملبوس کرائے خراجِ تحسین پیش کرنے آئے تھے۔ میں اسکے لئے گلاب کے اس پودے کی قلم جو اس نے مجھے دیا تھا لیکر آیا تھا۔ میں نے اپنی باری آنے پر اسکے تابوت پر زرد رنگ کی یہ کلی رکھ دی۔ اسی لمحے آرگن پر ایک دھیمی آواز نے ایک گیت چھیڑا جس کا مطلب کچھ یوں تھا

جب میں رواجات کے اختتام پر پہنچوں
تو میرے عزت مجھے مسکرا کر رخصت کرنا
یہ وہ سفر ہے جو ہمیں سب ہی کو اختیار کرنا ہے۔۔۔ اور تنہا ہی اختیار کرنا ہے
میری روح کا پنچھی آج آزاد ہو کر بیکراں فضاؤں میں پرواز کر گیا
پھر غم کیسا۔۔۔ مجھے یاد کرنا مگر بس کچھ ہی دیر

چرچ کا پادری اپنے خطبے میں کہہ رہا تھا "ہم آج کسی ویلیا سانچیز کا سوگ منانے نہیں بالکہ اسکی بھرپور زندگی کا جشن منانے آئے ہیں۔ آئیے آپ اس جشن میں میرا ساتھ دیں۔ یہ سن کر میں نے بھی اپنا سر جھکا دیا مگر نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے میرے گالوں پر ڈھلک آئے۔

دوسرا سچ

آنند لہر (جموں کشمیر)

لوگوں کے گھروں میں کام کرتے کرتے اُس کا بدن تقسیم ہو گیا تھا کسی گھر میں اگر ہاتھ اچھے طریقے سے کام کرتے تو دوسرے گھروں میں پاؤں۔ کسی گھر میں پورا جسم بھی کرتا تھا۔ سامنے والی پڑوسن کے برتن گھروں کے تھے اور سخت بھی اور لوگ تھوکتے بھی ان میں تھے سب کی صفائی لازمی تھی۔ اس لئے یہاں اُسکے ہاتھ پیارے تھے اور پھر دوسرے گھر میں بہت گرتے تھے سب کی صفائی لازمی تھی اس لئے یہاں اس کے پاؤں پیارے تھے اور تیسرے گھر میں رہنے والی بیوی مر چکی تھی اور بچے چاہتے تھے کہ ان کا باپ دوسری شادی نہ کرے اس لئے یہاں اُسکا جسم پیارا تھا۔ موت ہو گئی تھی اور اُسکے بچے بٹ گئے تھے۔ دال اگر ایک گھر کی کھاتے تو چاول دوسرے گھر کے اور سبزی تیسرے گھر کی۔ غریب انسان کا بدن بٹا ہوا رہتا ہے مگر اُسکی روح ہمیشہ قائم و دائم ہوتی ہے کیونکہ ہمیشہ محبت کی تلاش میں ہوتی ہے پھر کہانی بھی تو تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کہانی کا کردار ایک مزدور تھا۔ اُن کا ایک چھوٹا سا گھر تھا اور گھر کے اندر ایک چھوٹا سا آنگن۔ اس آنگن میں نہ جانے کیوں بہت سبزی پیدا ہوتی تھی وہ سبزی ہی اُن کا گزارا تھا۔ بس ایک بیج اور سینکڑوں پھل اور جو اُسے ہر روز کی مزدوری کا روپیہ ملتا اس سے اُن کے گھر کا گزارا چلتا تھا۔ وہ اسی سے اپنے ماں باپ کی سیوا کرتا تھا۔ اس طریقے سے وقت بیت رہا تھا۔ وہ بچے تھے نہ کوئی شکوہ نہ کوئی شکایت۔

ایک دن وہ بازار جا رہا تھا کہ ایک جلوس حکومت کے خلاف تھا مگر یوں کہا جائے کہ سخت خلاف تھا اور مہنگائی کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ راجہ ایک دیوار کے ساتھ کھڑا تھا چپ چاپ۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے حالانکہ یہ جلوس مہنگائی کرنے والوں نے ہی نکلوایا تھا جلوس نکلوانے والے کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ دیہاڑی داروں کو مستقل کرو۔ ان میں سے کوئی دیہاڑی دار نہ تھا وہ غریب نہ تھے پھر ایک شخص نے زور سے کہا بے روزگاری کا مسئلہ حل کرو کوئی ان میں کوئی بے روزگار نہ تھا غریب تو روزی روٹی کمانے میں مصروف تھے اور جو نعرے لگانے کے لیے اکٹھے کیے گئے وہ لاٹھی و گولی کھانے کو کسی بھی صورت میں تیار نہ تھے اور جلوس کی خبر تب تک نہیں آتی جب تک اس پر گولی نہ چلے لاٹھی نہ چلے جلوس لوگوں کو خبر دیتا ہے لیڈروں کو بیان دینے کا موقع دیتا ہے۔ جلوس کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف بڑھتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو چھیڑا جاتا ہے۔ لڑکوں کو جلوس میں شامل کر کے ان کے گھروں میں چھاپیاں کرائی جاتی ہیں۔ وہ دیہاڑی داروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ بے روزگاروں کے حق میں نعرے لگا رہے تھے اور لوگ یہ نعرے اس لئے لگا رہے تھے کیونکہ جلوس کے وجود کے لیے ضروری ہیں۔ جلوس آگے بڑھ رہا تھا کچھ لوگ رُکتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے پولیس والوں کے اندر ڈر پیدا ہوا کہ کہیں یہ جلوس آگے نہ بڑھ جائے۔ جلوس کے وجود کے لئے وجود ہی ضروری ہے جلوس میں لاٹھی چلتی ہے گولی چلتی ہے کچھ پولیس والوں کو میڈل ملتے ہیں۔ جلوس روکنے والے پولیس والوں کا نام آگے جاتا ہے وہ مشہور ہوتے ہیں۔ اُن کے بیان آتے ہیں مگر جلوس والوں میں سے لاٹھی گولی کھانے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ آفیسر نے دیکھا کہ ایک شخص ڈرا ہوا دیوار کے ساتھ کھڑا ہے اور غریب دکھائی دیتا ہے اس کے لیے لوگوں نے جلوس نکالا ہے مگر وہ جلوس میں نہ ہے یہ نعرے اس کے لیے ہیں مگر بدقسمتی سے وہ نعروں کا حصہ نہیں ہے اور یہ سارا سلسلہ جب آگے چلنے لگا تو جلوس کو ڈرانے کے لیے گولیاں چلیں اور خبر بنانے کے لیے ایک گولی راجہ کو مار دی گئی۔ ایک معمولی سا واقعہ رونما ہوا کہ راجہ مر گیا۔ بھاگنے والوں کو موقع مل گیا خبر دیکھنے والوں کو خبر مل گئی لیڈروں نے خوب مذمت کی۔ پولیس والوں نے ضروری بتایا اور جلوس روکنے کے لیے کچھ لوگوں کی پروموشن کی سفارش بھی کی گئی۔ اگلے الیکشن میں اُس کی موت بھی چناؤ کا موضوع بنی مگر اس کی بیوی بیوہ ہو گئی بچے یتیم ہو گئے ماں باپ بے سہارا ہو گئے اس کے بعد اس نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ گھروں سے بچا ہوا کھانا سبزیاں بچوں کو کھلاتی تھی اور پھر جب بجلی والا بل کا کرایہ مانگتا تو بوڑھے ساس سسر گھر سے چلے جاتے تا کہ اُن کی بیوہ الگ گھر میں رہ سکے اور جب راشن کا ڈیلر گھر آتا تب وہ ایسا ہی کرتے مگر ان سب چیزوں سے الگ وہ کرو اپنے بچوں کا پیٹ پالنے میں مصروف تھی ساس سسر کی خدمت کرنے میں کوئی کمی نہ رکھتی تھی اور یہ سلسلہ دو سال قائم رہا۔ اب تک گئی تھی کئی برس ہو گئے تھے اور چہرے پر کالا رنگ جھریاں پڑ گئی تھیں اور سچ یہ ہے کہ ایک وقت میں وہ سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔

پھر ایک دن راحت کا دن آیا اُس کے بوڑھے باپ کو چٹھی کے کچھ دن پہلے اس نے ایک دن اُسے بلایا اور کہا بیٹا کہ اُسے ضرور ایک دن کے لیے آنا ہے وہ بہت خوش ہوئی کیونکہ اُسے چار دن کے لیے اُسے کوئی کام نہ کرنا تھا صبح اپنی مرضی سے اٹھنا تھا اور شام کو مرضی سے سونا تھا دن کو جس وقت چاہے کھانا کھا سکتی تھی اور پھر اپنے باپ کے گھر دیکھ کے وہ تمام کپڑے سکون سکی تھی جو بھی خراب نہ ہوئے تھے۔ اگلے روز صبح اس نے اچھا سوٹ پہن کر تیاری کی اور بچوں و ساس سسر سے کہا کہ "میں چار دن کے بعد آؤں گی" بوڑھے سسر نے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ بیٹی چار دن کے لیے آرام کرو۔"

ان ہی خوابوں کے ساتھ وہ تیار ہوئی تھی۔ اس نے ایک ناٹک کیا اور اپنے میکے کے گھر چلی گئی جوں ہی گھر کے دروازے کے قریب پہنچی اُسے دھکا لگا کہ اُس کا بھائی اپنی بیوی یعنی اس کی بھابھی سے کہہ رہا تھا "مگر دوست مجھے معلوم ہے کہ تم کام کرتے کرتے تھک گئی ہو میری بہن آ رہی ہے وہ لوگوں کے گھروں میں کام کرتی ہے اُسے کام کرنے کا خوب تجربہ ہے۔ چار دن وہ سارے کام کرے گی تم آرام کر لینا اگر ہو سکا تو سنیما دیکھنے بھی جائیں گے۔"

یہاں پہنچ کر وہ جان گئی کہ یہاں تو سوچ ہی دوسری ہے

گلو گلزار کی باتیں

محمود الحسن
(راولپنڈی)

دلِ ویراں سے دلداروں کی باتیں
بیابانوں میں گلزاروں کی باتیں

شہنشاہوں سے ناداروں کی باتیں!
بہت دلچسپ ہیں یاروں کی باتیں

ہنسی آتی ہے جب بے دست و پا لوگ
کیا کرتے ہیں تلواروں کی باتیں

مریضِ عشق اور ہوگا شفا یاب
یہ سب باتیں ہیں غمخواروں کی باتیں

شکستہ پا سہی لیکن ہمیں سے
سنیں گے لوگ کہساروں کی باتیں

برائے مصلحت لوگوں سے کب تک
کریں گے آپ انکاروں کی باتیں

کبھی اہلِ جنوں کے سر بھی دیکھو
کیے جاتے ہو دیواروں کی باتیں

تمہارے بعد اے محمودؔ کن سے
سنیں گے لوگ غمخواروں کی باتیں

○

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

ہم کب یہ کہہ رہے ہیں کہ باہر کرو ہمیں
غائب اگر ہوئے ہیں تو حاضر کرو ہمیں

اک سانس کی مثال ہمارا وجود ہے
سوچو کبھی نہ شاذ کہ نادر کرو ہمیں

باطن ہمارا دید کے قابل نہیں رہا
جو کچھ بھی چاہتے ہو بظاہر کرو ہمیں

کیا جانے انتظار میں ہیں کتنی منزلیں
یعنی سفر سفر کا مسافر کرو ہمیں

کیسے چلے گا کوئی ہمارے بغیر کام
ہم حکمِ ناگزیر ہیں صادر کرو ہمیں

ایسی نہیں ہے بات تو اک ایک سے ملاؤ
گنتی میں آ گئے ہیں تو وافر کرو ہمیں

جیسی ہماری حیثیت بے مثال ہے
یادؔ اس طرح بھی حاضر و ناظر کرو ہمیں

○

محمود شام
(کراچی)

کوئی دستار سلامت نہ گریباں اب کے
کیسے آغاز ہوئی صبح بہاراں اب کے

روز ملتا ہے نیا رقصِ جنوں دیکھنے کو
فارغ اک لمحہ نہیں دیدۂ حیراں اب کے

وحشتیں توڑ کے ہر بند نکل آئی ہیں
نادم انساں کی حرکت پہ ہے حیواں اب کے

فیصلے زور سے اور جبر سے کرتے ہیں ہجوم
یہ ہے سلطانیٔ جمہور کا عنواں اب کے

سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کچھ بھی
ہے بیانات سے مفہوم گریزاں اب کے

عشق دوکانِ وفا کھول کے رہ سکتا ہے
حسن بازارِ حصص میں ہے نمایاں اب کے

○

شبنم شکیل
(اسلام آباد)

میں جو چپ ہوں تو یہ مت پوچھ کہ قصہ کیا ہے
اب زمانے کا سخن گوئی سے ناطہ کیا ہے

اب کوئی کام نہیں جیسے کسی کے بس میں
سب ہی دیکھتے رہتے ہیں کہ ہوتا کیا ہے

ہم مگن رہتے ہیں بس آپ ہی اپنی دھن میں
کوئی پڑھتا نہیں دیوار پہ لکھا کیا ہے

یہی انداز ازل سے ہے ابد تک جاری
مانگتے کیا ہیں مگر بخت سے ملتا کیا ہے

یہ بتا سکتے ہیں بس کربلا والے شبنم
پیاس کہتے ہیں کسے پیاس کا بجھنا کیا ہے

○

عبدالعزیز خالد

(لاہور)

زندگی جو ایک شے تھی بے بہا
ہوگئی نذرِ غمِ برگ و نوا

آسماں کو فرصتِ ماتم کہاں
اک ستارہ ڈوبے ابھرے دوسرا

انتظامِ دہر ہے کس کے سپرد؟
اے خدا! اے قادرِ مطلق خدا!

بات بھی دل کی وہ کہہ سکتا نہیں
کس قدر مجبور ہے انساں ترا

ہم نہیں تیرے کبھی دھارے کے ساتھ
اور قیمت اس کی کرتے ہیں ادا

برگِ گل سے کم نہیں ہیں خار و خس
ان کو بھی کرتا ہے مس دستِ صبا

وہ بھی ہیں جزوِ خمیرِ رنگ و بو
رزقِ خاکِ زرنگارِ گل کدہ

صاحبِ حرفِ ہوں لیکن خوشہ چیں
ہے کوئی تکمیلِ فن کی انتہا!

ہے کہاں ملکِ شبابِ جاوداں؟
ہے کہاں سرچشمۂ آبِ بقا؟

کس سے لیں خالدؔ سراغِ رفتگاں؟
ہے عدم کی رہگذر بے نقشِ پا!

فقاش کاظمی

(کراچی)

ساری خشکی اور سمندر آنکھوں میں
ڈوبے گا اب کون سا منظر آنکھوں میں

کوئی اس کو ہجر کہے یا محرومی
کاٹا ہم نے عمر کا چکر آنکھوں میں

آڑی ترچھی شکنیں ڈسنے لگتی ہیں
چبھتا ہے اب خالی بستر آنکھوں میں

راتوں میں ہیں موتی شبنم تارے پھول
دن کی ریت اور دھوپ ہے دن بھر آنکھوں میں

ہم جھیلوں کی گود میں پلنے والے لوگ
کیسے اتریں اس کی سمندر آنکھوں میں

واڑے کے والا شخص نہیں ملا!
پھینک رہا ہے چُن چُن کنکر آنکھوں میں

دفتر جاؤ تو بیوی بچے اور مسائل
گھر میں رہو تو سارا دفتر آنکھوں میں

بینائی کا کوئی محرک ہو فقاش
دید اُگے گی کیسے بنجر آنکھوں میں

○

ماموں ایمنؔ (نیوارک)

عشق کی منزل میں ہیں رستے بہت
ہم تلاشِ دوست میں بھٹکے بہت

زندگی کس پر ہوئی ہے مہرباں
شہر میں ہیں موت کے چرچے بہت

دسترس میں تھی کوئی تعبیر کب
زندگی نے خواب تو دیکھے بہت

خواب سے آنکھیں ہوئیں گویا کہ ہیں
پتھروں کے دل میں آئینے بہت

میری تنہائی بھی تنہائی نہیں
ساتھ رہتے ہیں مرے پیکر سے بہت

آرزو کی جستجو تازہ رہے
تجسس کے صحرا میں ہیں جھونکے بہت

آگہی کا ایک رُخ ہے خامشی
ہاؤ ہو کی دھوپ میں سایے بہت

اپنی آنکھوں میں بھی روشن تھے دیے
ہم نے بھی دیکھے ہیں دن اچھے بہت

بات دل کی دل ہی میں پنہاں رہی
راز گرچہ آنکھ نے اُگلے بہت

ہم رہے محروم دونوں ہی طرح
پیار میں ہارے بہت، جیتے بہت

حُسن کا در بند تھا ایمنؔ! مگر
سرگراں پیغام بر پہنچے بہت

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
(دربھنگہ بھارت)

وہ جو اک ہے عصری حسی آگہی کا آئینہ
اب تو کنٹرول کھو گیا اس کیپٹی کا آئینہ

بڑھ گئی ہے خوب آبادی اس مخلوق کی
اپنے ہاتھوں میں جو رکھی تیرگی کا آئینہ

دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں کچھ رہ گیا
زندگی بھر جس نے دیکھا بےکسی کا آئینہ

ظلمتوں کے شہر میں جانے سے پہلے رکھ بھی لو
کام آئے گا میاں کچھ روشنی کا آئینہ

رہزنوں کے درمیاں ہے مانگ اس کی بڑھ گئی
ان کے فن کی ہے ترقی رہبری کا آئینہ

کام یہ شہرِ وفا میں کر دے کوئی سنگ دست
توڑ دے گر ہو سکے آزردگی کا آئینہ

تبادل اب مناظرؔ تم بھی کوئی ڈھونڈ لو
کام کیا آئے صحافت شاعری کا آئینہ

○

ڈاکٹر خالد حمید شیدا

(یوایس اے)

دل کو وہ توڑ کر جو ہمارے چلے گئے
سارے وہ لے کے ساتھ سہارے چلے گئے

کالی گھٹا ہے شب ہے اندھیرا ہے ہر طرف
لے کر وہ ساتھ چاند ستارے چلے گئے

آنکھوں کی نیند اُڑ گئی اور ساتھ ساتھ اب
نئے جستجو کے بھی خواب پیارے چلے گئے

دل جل کے خاک ہو گیا آتش کے ساتھ سب
شعلے ہوئے تمام شرارے چلے گئے

باقی رہیں ادائیں وہ نخرے نہیں رہے
عشوے چلے گئے وہ اشارے چلے گئے

شیدا کو دیکھئے کہ محبت میں عمر بھر
تارے وہ آسماں سے اتارے چلے گئے

○

انوار فیروز

(راولپنڈی)

میں اندھیروں میں بھی سنورتا ہوں
میں کہاں تیرگی سے ڈرتا ہوں؟

میں بڑی احتیاط کرتا ہوں
پاؤں جب سیڑھیوں پہ دھرتا ہوں

حق کا پرچم اٹھائے پھرتا ہوں
میں کہاں بات سے مکرتا ہوں

اس کی پرواز آسماں کی طرف
میں تو پاتال میں اترتا ہوں

میں بُرا کسی کو نہیں کہتا
میں تو انساں سے پیار کرتا ہوں

میرا سایہ ہی میرا دشمن ہے
اپنے سائے سے میں تو ڈرتا ہوں

میری ماں کی دعا ہے میرے ساتھ
کب جہاں میں کسی سے ڈرتا ہوں

میں ہوں انوار روشنی کا نشاں
نور بن بن کے میں بکھرتا ہوں

○

ولی عالم شاہین (کینیڈا)

بجلیاں سی لفظ کی رگ رگ میں بھر دیتا ہوں میں
ظلمت سے پھر انہیں آزاد کر دیتا ہوں میں

دکھ کے سامانِ جراحت طشت میں ترتیب سے
زخم کو پھر اپنے ہونے کی خبر دیتا ہوں میں

آنکھ میں جشنِ چراغاں دل میں اندوہِ زیاں
پھر کوئی شہرِ غزل آباد کر دیتا ہوں میں

بات رکھتا مختصر لیکن میں ہوں کم حوصلہ
ایک مستانہ صدا ہر سانس پر دیتا ہوں میں

ڈوبتی سانسیں، گھٹی آہیں، سلگتی سسکیاں
زندگی تجھ کو سجا کر اپنا گھر دیتا ہوں میں

میں نہیں ہو جس کی ہے تجھ کو گلستاں میں تلاش
دل کو اندیشوں کے پت جھڑ کی خبر دیتا ہوں میں

جب بقا ہی مسئلہ ہو، کیا خوشی؟ کیسی خوشی؟
ہاں دعا سب کو خوشی کے نام پر دیتا ہوں میں

اپنی محرومی کا مانگوں بھی تو میں کس سے صلہ
اپنے ماتم میں کسی کے زخم بھر دیتا ہوں میں

عہد تازہ باندھتا ہوں عمر کے ہر موڑ پر
رخشِ جاں کو پھر کہیں اذنِ سفر دیتا ہوں میں

جب کبھی شاہینؔ موسم کی جفا کیشی بڑھی
دوستوں میں جشن کا اعلان کر دیتا ہوں میں

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

نہ دل میں کوئی خلش تھی، نہ تھیں پہلے
نہیں تھی کوئی ہمیں ایسی بے کلی پہلے

ہزار جینا بھی چاہیں تو جی نہیں لگتا
حیات ایسی بھی مشکل نہ تھی کبھی پہلے

سبھی کو جانا ہے اس بزمِ ہست سے اُٹھ کر
بس اتنا ہے کہ کوئی بعد میں، کوئی پہلے

چراغ بجھنے کے منظر سے کیا کوئی سمجھے
اندھیرا ہوتا ہے پہلے کہ روشنی پہلے

ہزار جذبۂ والہانہ تھیں چشمکیں لیکن
تعلقات میں آتی نہ تھی کمی پہلے

جہانِ عشق کا دستور عقل سے ہے جدا
خودی ہے بعد میں، لازم ہے بیخودی پہلے

بجا ہے خود کو سمجھنا خلیفۂ ارضی
مگر بنے تو یہ "انسان" آدمی پہلے

غزل بھی کیا ہے مرے دل کا مرثیہ گویا
یہی غزل تھی کبھی رنگِ زندگی پہلے

نہ جانے کیوں نہیں اب ہوتی کیا سبب ہے خیالؔ
وہ شعر کہنے پہ ہوتی تھی جو خوشی پہلے

○

غلام مرتضیٰ راہیؔ

(فتح پور کالمات)

کہیں ٹھیک ہے سب، کہیں گڑبڑی ہے
ہمیشہ سے دنیا ادھوری پڑی ہے

بہت خون اس میں بہا خواہشوں کا
عجب جنگ اک میں نے دل سے لڑی ہے

تعلق کی زنجیر پر زور مت دیں
کڑی اس میں نازک سے نازک پڑی ہے

میں تصویر بن کر اُسے دیکھتا ہوں
جو دیوار میں کیل خالی گڑی ہے

مثال اُس کی شہرت کی ایسی ہے جیسے
مرے قد سے پرچھائیں میری بڑی ہے

میسر تھا جس کو کبھی چھت کا آنچل
وہ دیوار اب سر برہنہ کھڑی ہے

تلاش و تجسس کے دیوانو! ہشیار
مری خاک بھی چھاننے کو پڑی ہے

جو میں آستیں میں چھپائے ہوں راہیؔ
نہیں اور کچھ بیش قیمت گھڑی ہے

○

سید ضیا شبنمی

(ملتان)

وہ خوابوں میں بھی اب ملنے لگی ہے
وہ کیا عشق فرمانے لگی ہے

جسے چڑ تھی ہمارے نام سے بھی
ہمارا ہی وہ دم بھرنے لگی ہے

اکیلے گھر کے سناٹوں میں وہ اب
اکیلے پن سے گھبرانے لگی ہے

تصور میں وہ میرا قرب پا کر
تصور ہی میں شرمانے لگی ہے

کوئی تو ہے جو میرے ساتھ شب بھر
ستاروں کی طرح جلنے لگی ہے

کتابِ عشق کے اسباق پڑھ کر
وہ آئینے سے بھی جلنے لگی ہے

محبت بھی تو مچھلی کی طرح ہے
بنا پانی تڑپا مرنے لگی ہے

○

محبوب ظفر
(اسلام آباد)

یہ جانتا ہوں وفا کرے گا جہان کیسی
سجائے بیٹھا ہوں پھر بھی دل کی دکان کیسی

یہ بات الگ ہے کہ اب پلٹ کر نہ آسکیں گے
مگر تھی اس بار پنچھیوں کی اُڑان کیسی

کئی برس سے ہم ایک ہی آنگن میں رہ رہے تھے
یہ آج دیوار آگئی درمیان کیسی

گھروں میں چھپائے پھرتے ہیں نفرتوں کو
بکھرے ہوئے ہیں منافقوں میں امان کیسی

نہ پوچھ میرے بدن پہ آئے ہیں زخم کتنے
یہ دیکھ مسمار کی ہے میں نے چٹان کیسی

ظفر جب اپنے عدو سے ہم خود ملے ہوئے ہیں
تو جنگ کیسی، شکار کیسا، مچان کیسی

○

شگفتہ نازلی (لاہور)
(فراز صاحب کی رحلت پہ کہی گئی)

وہ شاعروں میں خوش نوا احمد فراز تھے
ہر دلعزیز بھی سدا احمد فراز تھے

ایسے سخن تراشے کہ سب کو لبھا گئے
اسلوب بھی تو خاص تھا احمد فراز تھے

جالب ہی تھی مزاحمت اور رنگ فیض بھی
کچھ بھی کہیں پہ برملا احمد فراز تھے

دیکھا نہ جائے پھر بھی انھیں دیکھتے رہے
عالم تھا اُن کے شوق کا احمد فراز تھے

سارے ہی سلسلوں کو وہ توڑتے گئے
تھے سب کے بیچ بھی جدا احمد فراز تھے

کہنے کو دل کی بات بہانہ غزل ہوئی
تھا نام سوچیے تو کیا احمد فراز تھا

○

ضمیر نوری
(کراچی)

وسعتِ دشتِ سینہ میں وہ بھی رہتا تھا کبھی
آج قطرہ ہو گیا ہے کل جو دریا تھا کبھی

اس طرح کا خواب میں نے آج تک دیکھا نہ تھا
اپنی ہی آواز پر خود میں بھی چونکا تھا کبھی

آ گیا وہ دن، تمھیں جس کی خبر پہلے سے تھی
وقت کا شاہد جو لمحہ آ کے ٹھہرا تھا کبھی

یہ جو ہم صورت ہے میرا، کس قدر معصوم ہے
ایسے ہی لوگوں پہ مجھکو بھی بھروسہ تھا کبھی

دھوپ کا نیزہ لئے سورج بھی تھا سر پہ سوار
رہنے والوں کے لیے گلشن یہ صحرا تھا کبھی

اس کی آنکھوں میں تھی گزری ساعتوں کی اک جھلک
ایسا لگتا تھا کہ وہ میرا شناسا تھا کبھی

سخت نفرت ہو رہی ہے دیکھ کر تم کو ضمیر
اپنے سائے میں سمٹ کر میں بھی رہتا تھا کبھی

○

حنیف نجمی
(چھتیس گڑھ، بھارت)

گزر کر حدِ غفلت سے خبرداری میں رہتا ہوں
کہ میں آٹھوں پہر مرنے کی تیاری میں رہتا ہوں

خداوندا مرے پیکر میں ہے جب روح لاہوتی
تو ہر دم جلا پھر کیوں سیہ کاری میں ہوتا ہوں

سنا ہے خوش بہت رہتا ہے بیماروں سے وہ اپنے
سو میں بھی پُر سکوں ہر رنج و بیماری میں رہتا ہوں

زمیں سے آسماں تک ہے عمل میری محبت کا
جہاں رہتا ہوں میں اپنی عملداری میں رہتا ہوں

وہ خوشبو ہے مگر اس کو بھی چھو لیتا ہوں میں اکثر
کہ پاکیزہ بہت میں اس گنہگاری میں رہتا ہوں

میں وہ پاگل ہوں کہ ہجرت در چمن جس کا مقدر ہے
کسی کیاری میں کھلتا ہوں کسی کیاری میں رہتا ہوں

اُدھر وہ بے دھڑک آرے چلاتا ہے درختوں پر
اِدھر میں منہمک ہر دم شجر کاری میں رہتا ہوں

یہ دنیا کچھ کہے پروا مجھے بالکل نہیں نجمی
کہ میں کھویا ہوا اپنی قلم کاری میں رہتا ہوں

○

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

اک ایسی کیفیتِ ذات سے گزر رہا تھا
چمکتی دھوپ میں برسات سے گزر رہا تھا

نہ اس کے وصل کی خواہش نہ اس کے ہجر کا غم
عجیب صورتِ حالات سے گزر رہا تھا

چمکتی راتیں سیہ دن تھے میرے چاروں طرف
میں کیسے ارض و سماوات سے گزر رہا تھا

اُفق کے پار کوئی دنیا منتظر تھی مری
میں آسماں کے مضافات سے گزر رہا تھا!

پسِ غبار کہیں رہ گئی مری تقویم
میں اُس گھڑی نئے اوقات سے گزر رہا تھا

نجانے کیوں دلِ بے برگ و بار یاد آیا
میں جس گھڑی ترے باغات سے گزر رہا تھا

وہ آنکھ کر گئی روشن مرا بجھا ہوا دن
وگرنہ میں تو سیہ رات سے گزر رہا تھا

مہک سی آنے لگی ہے جواز لفظوں سے
یہ کون تیرے خیالات سے گزر رہا تھا

○

صفوت علی صفوت

(نیوارک)

مشتعل، نابابر رقص میں ہیں پروانے
اس جنوں کے پیچھے کیا ہے بس خدا جانے

ہم بھی اس کی حدت سے لب لگے ہیں گرمانے
ڈر ہے سب کی مستی میں ہوتے جائیں مستانے

سلسلہ تعصب کا ختم ہو رہے شاید
قرنِ وحدِ انسانی پھر لگا ہے آکسانے

ذہن میں غلامی کے ہے اُمید تو ایبک*
بن گئی حقیقت تو ہم لکھیں گے افسانے

نصف خونِ مسلم ہی ابتدا میں ہے کافی
صبر کرنے والوں میں ہم گئے ہیں پہچانے

اے خدا تری خاطر ہم چلے ہیں اس جانب
صدر کے چناؤ میں اپنا ووٹ گنوانے

آپ کی نظر صفوت ظاہر کا کب ہے
اس لئے اوباما کے ہم ہوئے ہیں دیوانے

دو ہزار نو کا ہے آج جیسواں سورج
قاضی عدالت ہیں تاج صدر پہنانے

قدرِ اوجِ انسانی ماپنے کو ہے راوی
ساقی اوباما نے بھر دیے ہیں پیمانے

نعرۂ مبارک میں ہم ہوئے ہیں سنجیدہ
اہلِ عقل چلتے ہیں گتھیوں کو سلجھانے

*ایبک: ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ قطب الدین ایبک، خاندانِ غلاماں

فرحت اور روی کی اپنی اپنی حدیں تھیں لیکن بہاروں بچے اپنے اپنے باپوں کی
شبیہوں کے باوجود اُسے یکساں ہی پیارے تھے۔ ان کے لیے کپڑے جوتے
خریدتے ہوئے روی کو کبھی احساس نہ ہوا کہ چاروں کس کس بیج پیار کی پیداوار
ہیں اور جن کے نطفے ہیں وہ نجانے کتنے حریص کس کس کی کوکھ میں بھر چکے ہیں۔
بھلا کوکھ کو بھی ثقافت کا ذکر کیوں عطا ہو گیا۔ کینگرو کی تھیلی جیسی یہ میلا جات سب
سمیٹ لیتی ہے کسی کو بھی زشت ہزش کہہ کر دھتکتی کیوں نہیں۔ حالانکہ انتقام لینے کو
ہی تو وہ ظالم اپنی اولاد گروی رکھ جاتے ہیں لیکن بیاری جس ماں پر تھوکتی ہے اس کی
کالخت کا ہوا چاٹ چاٹ کر پالتی ہے۔

آج بھی وہ ایک بار کر کر مر اور ہی تھی اُسے علم تھا کہ ان
تین چار حصوں میں اس کے چاروں بچے کتنے پھل پھول چکے ہوں گے۔ جب
تھالی میں بھات ختم ہونے کے بعد چپچپاتی ہوئی انگلیاں چاٹتے چاٹتے بوسیدہ
چٹائی پر سو جائیں اور تھوڑی دیر بعد سون رات بھر پہلے نہیں سکڑتے ہوں اس خوف
سے کہ اس ننھی بھر جھونپڑے میں اگر انگ کی سلاخ دھرے کی بیل کے چھاج
سے گرا تھی تو نجانے کتنی تیلیاں بیچ جائیں گی۔ گلیوں، جوہڑوں، نالوں کی
گیلی سطح پر بکھر کر سوتے پھر ان جھونپڑوں میں آگتی بھوک میں سے بھی اپنا
پیٹ بھر لیتے ہیں۔ سوکھی ٹانگیں ہوتے اُبھرے پیٹ ابر کو اُٹھے ہوئے پیٹ پجھروں
کی ہم شکل بے طلوق اپنا پیٹ کہاں سے بھریں کے دھان تو باڑھ میں بہہ جاتے
ہیں اور اپ تئے میں نجانے کن اجنبی سڑکوں کے ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں۔

اشیر اب دیار بکھر چکا تھا۔ بیچ دریا پانی میں پتوار تنگ خلاف ہو رہے تھے
جھاگ برف سا گاڑھا اور سفید تھا۔ جس کی اچھال کے پیچھے نواب سلیم اللہ خان
کے محل کی بلند محرابیں دھندلا رہی تھیں۔ جس کے برجوں پر لکھتے ہوئے
سیاہ بنگلہ دیش کی آزادی کی داستان پاس اسٹیمر سے ہی رہے تھے جو ایک ہاتھ
میں بکڑے ایک ریلی سانی تقریبا با رد ہیرا رہا تھا۔ جس کے سامنے لگی فرنٹ میں
بچھی ساری کرسیاں خالی تھیں۔ بوڑھی گنگا پر تے طویل پل کے نیچے معلوش گی
کچھ بھی نہیں سے قاصر تھے اور موٹے موٹے ہندو سیٹھ ناریل اور کیلوں کے
ڈھیروں پر بیٹھے بانس کی تیلیوں جیسی پسلیوں والے اور چار خانہ لنگوٹوں والے
کالے بھجنگ بنگالیوں کی پشت پر چھیاں لدوا رہے تھے۔ مقرر کہہ رہا تھا آج
کے دن بنگال آزاد ہے۔ بنگالیوں نے یہ آزادی بہت قربانیوں کے بعد حاصل کی
ہے کتنے برسوں ہمارا لہو پاکستانیوں نے چوسا ہے ہمارے بھائیوں کا خون
بہایا ہے ہمارا پتر چار کیا ہے لیکن اب ہم آزاد ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔۔۔
روی نے سوچا: یہ کیا کم ترقی کی ہے کہ آزادی کے بعد یہاں پارٹی اپنگل ہے
یہ اعزاز تو یورپ کو بھی حاصل نہیں ہے کنڈوم کی مشینیں ہٹ گئی ہیں جتنے چاہو
بینک میں بھر لو اگر پھر بھی پھنس جاؤ تو ایسی این جی اوز بیر یڈ رکھوالا کرنے کو جگہ جگہ کیمپ
لگائے بیٹھی ہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد عورت کو بھی آزادی ملی ہے کہ وہ مرد کی
غلامی سے نجات پا گئی لیکن یہ کیا کہ پیٹ کی غلامی میں جکڑی گئی۔ بے باپ کے
بچوں کی زنجیروں میں بندھ گئی۔ جن کے پیٹ کی آگ بچوں کی جدائی کی سلگن
نے اور بڑھا دی ہے جسے میلا نجانے این جی اوز بھی سرنگوں کر پائیں۔ یہ میلا تو
جیسے دل کے ریشے میں کیل جیسی پیٹ کی ڈوری کو دوری ہو اور پھر سے لگا کے
آلودہ پانیوں میں پھینک دیا گیا ہو جیسے سڑنے ٹوٹنے اور راکھ ہو جانے کے
لیے۔ نجانے یہ کوکھ کیوں سمیٹ لیتی ہے جب اپنے اندر نیا دل، ناپسندیدگی،
نفرت، مجبوری کو تخلیق عطا اتی ہے۔ اسے پسند، ضرورت یا خواہش کا اختیار
کیوں نہیں ہے۔ یہ فطرت بھی عورت کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے۔ وہ ڈھاکہ
کی سڑکوں پر چار خانہ دھوتیوں میں ستر لپیٹے سائیکل رکشہ کھینچتے سوکھے سڑے
بنگالیوں کو دیکھتی تو سوچتی پتہ نہیں کہاں کہاں چھوڑ آئے ہوں گے اپنی اپنی
غلاظت کس کس کی کوکھ کا پابند کر کے خود آزاد اور لا پروا گھومتی کو کہ دل نہ نکل پائے نہ
اُگل کر ایسی ماں اپنے بچے خود کی ہی کاٹ چھانٹ کرنے کی آزادی تو ملی لیکن
اس دل کی تیلیاں وجود کے بت کی کوکھ لگائی کیوں دیتی ہیں۔۔۔

اسٹیمر یک دم جھٹکے کھانے لگا۔ شاید کیلوں یا پٹ سن کی گلی سڑی
گانٹھیں تہہ سے ابھر کر پہیوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسٹیمر کے نچلے حصے میں ناریل
بھرے تھے۔ دوسری منزل میں مسافر بیٹھے تھے اوپری منزل میں بے چہرے
چھوٹے کیبنوں کا ڈھیر لگے تھے۔ پتہ نہیں کس میں کیا بھر اتھا جو بھرنے کو بھی
خالی تھے اُسے خوف سے ان کی ماں لگی۔ حسن بھوٹے جیسے نجانے کتنا سوا
بھرا ہوا اندر باہر خالی خالی دماغ جیسے علاقوں کے وزراء کی صدری پہنے گھنٹوں
سے ذرا نیچے چار خانہ دھوتی باندھے طرح کشتیاں اور کیٹو کھے رہے تھے بیچ دریا
اسٹیمروں اور بیٹوں سے چھٹے خالی پیٹ بلبلیں سے لٹی تھی جن میں مچھلیاں
ہنڈے سرخ ٹھے لگاتیں۔ طرح گیت گاتے اور سیاہ غرشے پر رقص کرتے
تھے۔ اسٹیمروں کی نالیوں سے غلیظ سیاہ پانیوں کی جھاگ جیسے خوفناک
تاریک جزیروں میں سارے اسٹیمر بیٹی کیٹو کشتیاں اور ڈنگائیں نکل جائیں
گے۔ صاف کوئی اس کی سوچیں اسی دیسی ہی پراگندہ ہو کر جھاگ اُڑانے لگی ہیں۔
اس نے بغل میں پڑی اپنی پوٹلی کو شولا۔ سلیے بنکٹ، ہوا اُچھوڑتے رہیں کچھ ہرا
اور سیاہ ناگ لگے جن کی بھنک سیاہ گہرے پانیوں میں بہتی غلاظی اور کے نیچے لمبی
سرنگ میں بھرے تھیوؤں کے نیم مردہ جسموں کو چار خانہ دھوتیوں اور اُٹی شرٹوں
والے نحیف نزار مرد اور بچے بلا کہہ رہے تھے۔ کیلوں اور ناب کی گانٹھیں شکن ناریل
کے ڈھیروں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوئے موٹے سیٹھ بھی جھولے ہوئے پیٹوں
میں اُسے اپنا تیسرا شوہر رحمت نظر پڑا اس نے حقارت سے تھوکا جو بلبلے بھری
پانی کی کثیف تہہ میں کہیں جذب ہو گیا اور رحمت کے ہم شکل بچے کی یاد میں وہ
کراہی وہ چاروں بچوں میں سے زیادہ خوبصورت گورا اور کھلے ہاتھ پیر والا تھا۔
رحمت کی نفرت اس تیسرے بچے کی شباہت میں دل پر ملکسلائی تو وہ قہقہہ لگا کر

نے وہ لاکھوں بھائیوں کی قربانی دی جن کے خون سے رنگین یہ دھرتی آزاد ہوئی۔ اسٹیمر کے عرشے پر دیش بھگتی کے گیت گائے جا رہے تھے رقص کرتے ہوئے نوجوان آزادی کا جشن منا رہے تھے جن کے بڑوں کی اجتماعی قبریں شہید چنار میں پھیلی تھیں۔ اسٹیمر کے عرشے سے شہید چنار کی بلند گون دکھائی دے رہی تھی جو بنگلہ دیش کی آزادی کی علامت تھا جس کے گرد گھاس سے ڈھکے بڑے بڑے قطعات پر Grave Yard کی تختیاں لگی تھیں یعنی یہ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں شہید ہونے والوں کی اجتماعی قبریں تھیں۔ شہید چنار کے گرد و گرد چاروں طرف جھیلیں بنی تھیں جن کے گدلے پانیوں میں جنائی شاپا کھلا تھے۔

شہید چنار کے نکونے ستون نظر آتے ہی آزادی کے نعرے پرجوش ہو گئے۔ شراب کی بوتلوں کے ڈاٹ کھل گئے۔ گنگا کی سطح پر بکھرے اسٹیمر اور ناؤکاؤں پر برقی قمقموں میں کتنے رنگ جھلملا رہے تھے جیسے پانی کے اندر آگ سی لگی ہو۔ اب ملاح اور مسافر خالی بوتلیں دریا میں پھینکتے آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے لڑکھڑانے لگے۔ کئی وہیں ڈھیر ہو گئے۔ آج آزادی کی رات ہے۔ سروجنی نے تیل بنانے کا کال اور سیاہ چمکتے بالوں کے جوڑے میں ٹکی چوڑی والی ساڑھیوں میں ملبوس عورتوں پر نگاہ کی۔ آج پانچ سو بیزار تو ضرور بن جائے گا۔ ابھی گاہک آئیں گے ایک ایک کے کان میں کچھ کہیں گے کبھی اشاروں میں سرپائیں گی کبھی قرار میں اور پھر چلو پانی جیسے پیچھے چل پڑیں گے۔

رات گنگا کے پانیوں جیسی سیاہ پڑ رہی تھی۔ اسٹیمروں کی روشنیاں جگنو جیسے ستاروں بھرا آسمان پانی پر اتر آیا ہو۔

اب عرشے پر دھاچوکڑی کرنے والے نچلی منزل میں بیٹھی عورتوں کے کانوں کان گزرنے لگے۔ سب سے پہلے سروجنی اٹھ کے گئی اور فرسٹ کلاس والے کیبن میں گم ہو گئی۔ جوان عورتیں تو بس ایک بلے میں ہی اپنی جگہیں خالی کر گئیں جیسے باڑھ کا ایک ہی ریلا پکی فصل بہا لے گیا ہو اور پھر یک دم بہت گر گئے اس تھرڈ کلاس کے کیبن میں عورتیں ناکے والوں کی مسل مسل جیسی منہ سے کی خبر دے رہی تھیں۔ اسٹیمر میں بیٹھی رہ جانے والی عورتیں اپنے گھروں کو جا رہی تھیں اور اپنی جمع پونجی میں جو اضافہ بھی ہو سکے اُسے چھوڑنا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے ریٹ مزید گر گیا۔ سو ہوا طے کیے بنا ہی اشارہ پا کر چلنے لگیں۔ رولی جس ماسے لُقمہ کے آدمی کے پیچھے پیچھے چلی وہ اس کے دوسرے شوہر سے مشابہت رکھتا تھا وہ اُس کے ساتھ کبھی نہ کھلتی لیکن یہ آخری پیشکش تھی ورنہ اُسے رات بھر کیبن میں رہ جانے والی بوڑھی عورتوں کے قرار لے بن کر گزارنی پڑتی۔ نقصان صرف پیسے ہی کا نہ تھا اپنی اوقری کاڈ کہ اس ایک رات میں اُس کا کتنا رس نچوڑ کر اریل کے گھاس کی طرح کتنا خشک اور بیرنگ بنا جاتا لیکن نہ جانے والے کیبن میں موجود شخص کو پہچان کے خطے کی لپک نے اس خشک گھاس کو پکڑ لیا۔ وہ اس کا دوسرا شوہر ہی تھا جو اُسے ڈھاکہ کی ایک مچھروں بھری کھولی میں سوتا چھوڑ کر چلا گیا تھا کیونکہ کئی مہینے وہ اُس کی بچی کو جنم دینے والی تھی اور کچھ وقت کے لیے بیکار ہو جانے والی تھی۔

اسٹیمر نے زور سے دھکا کھایا۔ شاید اریل کے کئی پودے غرق دیا تھے جو یکدم سے بیچ دریا پر اُبھر آئے تھے۔ کشن اُس سے یوں لپٹا جیسے برسوں کے بچھڑے پریمی اچانک کسی ایسے جزیرے میں مل گئے ہوں جہاں کی تمام آبادی کو کسی آفت نے نگل لیا ہو اور بس وہ دونوں ہی بچے ہوں۔ فطرت کی پوری طاقت سے رولی نے اُسے پرے دھکیلا۔ وہ اس اچانک افتاد سے لڑکھڑا کر کیبن کے بند دروازے سے جا لگا۔ اسٹیمر کے انجن کا شور شب کی تاریکی میں خوفناک ہو کر گرجنے لگا اور ایک برتھ والے کیبن کے سارے جوڑ جیسے کھل گئے۔ اُس نے کیبن کی بند کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر جیسے خود کو ڈگمگاتی خوف کے حملے سے سنبھالا۔

"ویسے تو میں پانچ سو ٹکا وصول کرتی ہوں لیکن آج سوراج کی رات ہے اس لیے ہزار ٹکا ہو گا۔۔۔ بول قبول کریں۔"

کشن زور سے ہنسا اور عرشے پر بجتے لاؤڈ سپیکر نے تیز چیخ سی بن گئے تھے جس میں اسٹیمر کے انجن کی آواز جیسے دھڑکنیں ملانے لگے۔ مل رہی ہو ستارہ رہا تھا سارے کیبنوں کے بند دروازوں سے نسوانی اور مردانہ قہقہوں کی آوازیں شہوت میں گھلی باہر نکلیں۔ کشن پھر دروازے کے پاس جا کر بولا "اری رولی تو تم بنگلوں کی کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تجھے۔ ہم آج بھی پتی پتنی ہیں۔ ہمارے درمیان طلاق تھوڑی ہوئی تھی۔ رولی تو آج بھی میری۔۔۔"

"تیری پتنی ہو گی تیری ماں، سودے کی بات کر ہزار ٹکا پھر دروازہ کھول کیبن کا۔۔۔"

کشن پر جیسے پاگل سا گیا۔ کیبنوں سے نکلتی مرد و زن کی دبی دبی شہوت بھری آوازیں جیسے اُسے نڈھال کر گئیں۔

"دیکھ کیسا اتفاق ہے کہ یہاں کوئی بھی دیانہ ہو گا جو اپنی ہی پتنی کو ٹکے بھر کے لیا ہو۔ پر چل تیری مرضی۔۔۔"

کشن نے سستی رم نکالی کا گھونٹ بھرا "سالی تو بھی پی۔"

"رولی نے بوتل پر ہاتھ مارا۔ مجھے مت بہکا، مطلب کی بات کر ورنہ دروازہ کھول۔۔۔"

بوتل گری تو فرش پر سرسر جھاگ سی اُبلنے لگی۔

کشن کھڑا ہو اٹھی ہوئی بوتل کو پیر مار کر اوپر اچھالا جھاگ بھرا پانی رولی کو بھگو گیا اس کے چکنے گال لاٹھیں مارنے لگے۔

"اری تو تو بڑی ظالم ہو گئی ری۔۔۔ یہ پکڑ گن لے پورے دس نوٹ ہیں۔۔۔ اب میرے بچے کا بول۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی ہوئی ہے۔ اب اتنی تو ہو گئی ہو گی۔"

کشن نے دونوں بالشت جوڑیں اور پھر بوتل کا ڈاٹ بند کر کے اُٹھایا۔ جھاگ کا قطرہ اُچھل کر رولی کی آنکھ میں آنسو سا اٹک گیا اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ بجلی دل میں گرنے سے ہونٹ ڈرنے لگے۔

بچے کا مذاق مت اڑا کیا کا ہے سے اس پر رولی نے دس

نوٹ اُچک کر بیگ میں رکھ کر تالا لگایا۔۔۔

"چپ کر کے کھانا بس اور اپنے پیسے پورے کر۔ باپ کا نام نہ کر مجھے اور بھی کئی کام ہیں۔" بختش کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سب بند ہو گیا نوٹ بھی اور لڑکی بھی بس وہی سامنے تھی۔ اس نے بوتل وہیں کے منہ سے لگائی۔

"یہ تو پی مجھے یاد ہے تو پی کر کی مست ہوتی ہے۔ ورنہ کمانے کو وقتی ہے" بختش نے سینہ کھول کر قمیض اچھال جو کیبن کے زرد بلب کو ڈھک گئی۔

"لے اب لاؤ مجھ سے کاٹ لے مجھے۔۔۔"

ہر لڑکی کے کئی گھونٹ وہیں کے خشک حلق میں اتر گئے تھے اور اس کے بوسیدہ تھکے ہوئے جسم میں ایک تازگی اور قوت آ گئی تھی۔

رات کالی تھی لیکن جشن آزادی کے قہقہے پورے اشیر کو شہر چراغاں بنائے ہوئے تھے۔ تھرڈ کلاس کے کیبن میں رہ جانے والی عورتیں لوگ گئی تھیں اور انھیں دیکھنے کو اب وہاں کوئی کا بک نہ بچا تھا۔ کسی ہوا دی تھی۔

"کیسی آزادی ہے کہ میلا کا اعلان ہو رہا ہے۔ ہم کا رہ گئیں جو کل تک۔۔۔ پاکستانی فوجیوں سے بھی گئے طے کرتی تھیں یہ کیسی سوراج ہے کہ اپنے ہی رکھشک ہیں۔" وہ منہ پر ساڑھیوں کے پلو ڈالے کبھی روتیں کبھی بین ڈالتیں تو کبھی نعرے لگانے لگ آتیں۔ جو سب اشیر کی گڑگڑاہٹ میں کہیں لپٹ جاتا۔

بوڑھی گنگا کے پانیوں میں رات گھل گھل کر ڈھل گئی تھی۔ کثیف پانیوں کی ساری آلائشیں تہہ میں اتر چکی تھیں۔ سطح آب پرسکون تھی۔ سورج سنہری تھالی جیسا لہروں پر بکھیر رہا تھا۔ جس کی ننھی ننھی کرنیں پانیوں سے بھنوروں میں بکھر رہی تھیں۔ دریا کے کنارے کیلوں کے چھلکوں، ناریل کے چھلکوں اور سیاہ کیچڑوں سے بھرے تھے۔

اشیر لنگر ڈال چکا تھا۔ کشتیوں کا جھونا ہو یا قلیوں اور کھیوں سے اٹا تھا۔۔۔ جس سے مسافر بچ بچ کر گزر رہے تھے۔

اب اشیر کو صرف تل تل کر رات بھر کے جشن آزادی کی کثافتیں دھوئی جا رہی تھیں۔ ڈیک پر صرف ملبالی کی جو جھاڑ پڑی تو وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ اشیر دھونے والے جیسے۔

"ارے تو ابھی آزادی کا جشن ہی منا رہی ہے۔ دنیا اپنے گھروں کو بھی پہنچ گئی۔" اس نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ بختش کے کپڑوں اور پیسوں والا بیگ کھانے کی اشیاء والی پوٹلی، دونوں چیزیں یکدم غائب تھیں۔

"بختش"

اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بوڑھی گنگا کے آلودہ پانیوں میں آلائش بن کر کہیں تہہ میں اتر گئی۔ جہاں آزادی کے جشن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

نذرِ ڈاکٹر مظفر حنفی

انیس عظیم آبادی (کرہٹی کولکاتا)

اقدار کی پہچان بچائے رکھا
تعلیم کا عرفان بچائے رکھا
تولا نہ کبھی خود کو مظفر زر سے
اس دہر میں ایمان بچائے رکھا

تعلیم کے زیور سے سجانا تیرا
جینے کی صحیح راہ دکھانا تیرا
دنیا میں نہ جب ہوگا تیرا تن حنفی
ڈھونڈے گا ہر اک شخص ٹھکانا تیرا

اسلوبِ سخن فن میں ہے ندرت تیری
ہر صنفِ سخن پہ ہے قدرت تیری
افکار کے اظہار میں رغبت ایسی
ہر شخص کو بھا جاتی ہے رنگت تیری

ہر سمت سے گو تجھ پہ تنقید ہوئی
جو بات کہی تو نے تردید ہوئی
پھر بھی ترے شعروں کی خوشبو نہ گئی
ہر گام ترے فن کی تائید ہوئی

مانا کہ قافل میں ہیں ممتاز نہیں
انداز سخن تو ستو پروانہ نہیں
تنقید سے آلودہ نہ کر حسنِ ہنر
یہ علم خدا داد ہے اعزاز نہیں

○

بے باق

تحسین احمد (حیدرآباد دکن)

میرا ایک پاؤں زمین پر تھا۔

دوسرا پاؤں زمین کے اوپر۔۔۔۔ چھ سات انچ کی بلندی پر جیسے معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ پاؤں نکالتا تو گستاخی کا مرتکب ہوتا۔ کیونکہ میں نے اس مہاتما کی تصویر دیکھ لی تھی جس نے ہم کو آزادی دلائی تھی اور ہم نے اس آزادی کی مٹی پلید کر دی۔ جس نے ہم کو عدم تشدد کا گر سکھایا تھا اور ہم تشدد پر اتر آئے۔ اس کے علاوہ بھلے سرخ رنگ کا وہ کاغذ کا ٹکڑا بھی عزیز تھا جس کے وجود سے ہماری زندگی میں رنگ و نور ہے جس سے ہمارے پیٹ کی آگ بجھتی ہے۔ ہمارے تن کو کپڑا میسر آتا ہے جو ہماری طاقت ہے اور کمزوری بھی۔۔۔۔!

میرے دوسرے پاؤں کے نیچے ایک ہزار کا نوٹ پڑا ہوا تھا۔

میں رکوع کے انداز میں زمین پر جھکا اور بڑی پھرتی سے ہزار کا نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس عمل سے گزرتے وقت نہ میں جھجکا اور نہ شرمندگی کا احساس میرے اندر پیدا ہوا تا ہم دیر تک میں وہیں کھڑا رہا تا کہ اس نوٹ کا کوئی وارث آ جائے تو نوٹ لوٹا دوں۔

نوٹ جیب میں رکھتے وقت مجھ کو کسی نے نہیں دیکھا تھا' اس کا مجھے یقین تھا اور دیکھتا بھی کون؟ وہاں جتنے لوگ نظر آ رہے تھے وہ سب مصروف تھے یہ وہ لوگ تھے جن کو دولت کی فراوانی' بے فکری اور آرام طلبی نے خود غرض بنا دیا تھا اور وہ سب ہوا کے غبارے بن گئے تھے' راتوں کو خواب آور گولیوں کا استعمال کرتے اور صبح صبح چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ ان کے ساتھ ان کا کتا تھا' زنجیر تھامے کتے کے پیچھے پیچھے وہ دوڑتے رہتے۔ جن کے پاس کتا نہیں تھا' ان کی بیوی ہوتی' جن کے ساتھ کتے نہیں ہوتے بیویاں نہیں ہوتیں وہ اپنا کوئی نہ کوئی ساتھی ڈھونڈ لیتے کیونکہ تنہا چہل قدمی بے مزہ ہوتی ہے کوئی ساتھی ہو تو چہل قدمی کا مزہ دوچند ہو جاتا اور دیر تک چہل قدمی جاری رہتی ہے۔

میں نے اپنی چہل قدمی بند کر دی اور وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ نوٹ میری جیب میں تھا' میں نے جیب پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا تھا' خدشہ تھا کہ کہیں نوٹ ایک پنچھی بن کر' تتلی بن کر میری جیب سے اڑ نہ جائے لیکن نوٹ اڑا اور نہ کوئی دعویدار آموجود ہوا۔ لیکن اب میرے اندر کئی سوالات شور مچانے لگے تھے کہ ہزار کا نوٹ کا کیا کیا جائے؟ کس طرح اور کہاں خرچ کیا جائے؟

تیس دن تک صبح سے شام تک سخت محنت کرنے کے بعد جو تنخواہ ملتی' اس کو پہلی تاریخ کے دن بنیادی ضرورتوں کا اژدہا ایک ہی جھٹکے میں ہڑپ کر جاتا تھا۔ کبھی اتنی فاضل رقم نہیں بچتی تھی کہ تفریحات کی سوچتی۔ مگر آج غیر متوقع رقم ہاتھ لگی تھی۔ جس کو میں تفریحات پر صرف کر سکتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ گل چھرے اڑا سکتا تھا۔ کسی شاندار ہوٹل میں لنچ اڑا سکتا تھا۔ کسی سینما ہال میں فلم دیکھ سکتا تھا۔ کلب میں بیٹھ کر رمی کھیل سکتا تھا یا پھر۔۔۔۔؟ جو پیسہ اچانک اور محنت کے بغیر ملتا ہے وہ ایسے ہی کاموں میں تو خرچ کیا جاتا ہے جس پیسہ میں محنت کے پسینے کی بو کی آمیزش نہ ہو وہ بے دریغ خرچ ہو جاتا ہے۔

لیکن اب میں کسی منطق میں الجھنا نہیں چاہتا تھا' جو نوٹ ہاتھ لگا تھا اُسے اپنی ذات پر خرچ کرنا چاہتا تھا اور عیش کی منا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی عیش کی منتشر سالمیاں اچھی لگتی ہیں' اس سے زندہ رہنے کا احساس روشن ہو جاتا ہے اور آج میں اُس احساس کو روشن رکھنا چاہتا تھا۔ آج میں تو جیسے فضا میں اڑا جا رہا تھا۔ مگر بچپن سے رائج کا ایک سنہرا خواب مثل ہوائی بن گیا تھا۔

اس دن میں آفس نہیں گیا۔

یکسوئی اور اطمینان سے بیٹھ کر آج کا پروگرام بنانا چاہتا تھا کہ اتنے میں نعیم فاروقی کا فون آ گیا' میرے لکھنے پڑھنے کے سارے کام جو کچھ بٹے ہوئے ہیں اس کو نعیم فاروقی انجام دیتا ہے۔ صدر بازار کی ایک چھوٹی اور تنگ جگہ میں وہ صبح سے رات تک رزق کی جستجو میں بیٹھا رہتا ہے' ایک عمر جوں گزارا ہوا لیا اور کئی عمر بیٹھے ہوتے ہوئے کچھ نعیم فاروقی کے مداحین ہیں۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ شادابی کے عوض بھی نظر نہ آئی جو خوشحالی کی دین ہوتی ہے۔ میں نے اس کو دیکھ کر اکثر سوچا ہے کہ محنت کے سوا اور چیز بھی ہوتی ہے جو انسانوں کے چہرے سے عیاں اور جھانکتی ہے۔ وہ تعمیراتی کاموں' کارخانوں' ریلوے اسٹیشنوں اور بازاروں میں جتے ہوئے مزدوروں کے جسموں پر بیشتر نظر نہیں آتے۔

نعیم فاروقی سے گفتگو کے دوران اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا' میں نے فوراً اس سے پوچھا "فاروقی جی! اگر آپ کو کہیں سے اچانک ایک ہزار روپے کا نوٹ مل جائے تو آپ کیا کریں گے؟"

"ایک ہزار!" میں نے محسوس کیا کہ فاروقی کی آواز میں لرزش آ گئی ہے جیسے حقیقتاً ایک ہزار کا نوٹ اُس کی جیب میں آ گیا ہو۔ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس کی پرجوش آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "ہم لوگ عموماً 2.5% کے حساب سے زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اگر مجھ کو ایک ہزار روپے مل جائیں تو دس فیصد روپے حاجتمند لوگوں میں بانٹ دوں گا اور باقی کی رقم سے اپنے بچوں کی فیس ادا کروں گا۔ آپ جانتے ہیں اس مہینے میں اسکولوں میں فیس اور ٹرم فیس کتنی سختی سے وصول کی جاتی ہے۔"

نعیم فاروقی ادیب ہے۔ بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ خون پسینے کی گاڑھی کمائی لٹانے کے باوجود ہماری اولاد تعلیم سے کیوں محروم ہے اور وہ مال غنیمت کی رقم سے بچوں کو کیا تعلیم دلا سکے گا؟ آج ہم صرف تعلیم ہی نہیں' ہر میدان میں دنیا کی اور قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے ساحل پر اترنے کے بعد کشتیاں جلائی تھیں۔ ہم نے تو روانگی سے قبل ہی اپنی کشتیاں پھونک دی ہیں۔ فاروقی کی بات میرے حلق سے نہیں اتری۔

یکایک مجھ کو سلمیٰ کا خیال آیا جو میرے آفس میں کمپیوٹر آپریٹر تھی۔

اس کی تھرکتی انگلیاں بالوں میں اور پھر کمر پر تھرک رہی تھیں مگر لوگ اپنا اپنا جام لیے تھے
اس کے سلونے سے چہرے کی دلاویز مسکراہٹ، انداز تکلّم دیکھ کر لوگ طرح طرح
کے خواب بُنتے نظر آتے تھے اور وہ بھی ۔۔۔۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کب پھسلتی
ہے اور کہاں پھسلتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "سلمیٰ! اگر ایک ہزار روپے
تمہارے ہاتھ میں آ جائیں تو تم کیا کرو گی؟"

"ایک ہزار" سلمیٰ نے حیرت سے دہرایا اور پھر میں نے چٹک کی
سی آواز سنی لیکن یہ کلیوں کے چٹخنے کی صدا نہیں تھی۔ اس نے تو رسید چوم لیا تھا۔
میرے سارے جسم میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ گھڑی بھر کے لیے مجھ کو ایسا لگا کہ وہ
جیسے موبائل سے نکل کر میرے قریب آ گئی ہے اس کی سانسوں کی خوشبو اس
کے رخسار کی تپش میں اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔ وہ بولی "ہم آج کی شام
ہنگامہ خیز شہر سے دور کسی Resort پر گزار سکتے ہیں۔ تم نے کبھی اس زندگی کا
مزا چکھا ہے؟"

سلمیٰ کی بات کا کیا جواب دیتا۔ دس سال کی ازدواجی زندگی میں
ایک عدد بیوی اور تین بچوں کا باپ بن کر میں نے بہت بڑا تیر مار لیا تھا۔ کبھی اس
کنویں سے باہر نکلنے کا موقع ملتا تو دیکھتا کہ دنیا کتنی وسیع ہے کتنی رنگین ہے۔
میری زندگی میں بیوی آئی تھی محبوبہ نہیں۔ حالانکہ جانتا تھا کہ جو بات محبوبہ میں
ہوتی ہے وہ بیوی میں نہیں ہوتی۔ بیوی ایک سمندر کی طرح ہوتی ہے جو گہرا ہے
اور بیکراں ہے لیکن پُر سکوت ۔۔۔۔ اس کی بے تابیاں بھی ساحل سے ٹکراتی
ضرور ہیں لیکن بے آواز ۔۔۔۔ اور محبوبہ تو ایک پُر شور دریا کی طرح ہے جس میں
سیلاب آتا ہے تو خود بھی فنا ہو جاتا ہے اور سامنے والے کو بھی فنا کر دیتا ہے۔

لیکن میں بھی اپنے وجود کو فنا کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر آج یہ
سکے جو سامنے آ رہے تھے جس کی وجہ سے میں ایک حیرت انگیز کیفیت سے
دوچار ہو گیا تھا۔ مجھے مزید کچھ ذہنوں کو ٹٹولنے کی سوجھی۔ میں نے اقبال رنگ
والا کو فون کیا۔

اقبال رنگ والا۔ رنگ بناتا اور رنگ بیچتا تھا۔ وہ رنگ نہیں جو
دروازوں، کھڑکیوں اور دیواروں کے کام آتے ہیں۔ وہ رنگ بھی نہیں جو مصور
اپنی تصویروں میں بھرتا ہے بلکہ وہ رنگ جو دوشیزائیں اپنے ناخنوں اور لبوں پر پھیرتی
ہیں۔ جو تتلی رنگ کی رسیا ہوتی ہیں۔ اور اقبال عورتوں کا رسیا تھا۔ عیاشی کا عادی تھا
مگر نکاح کا قائل نہیں۔ وہ تو ایسا آدم خور تھا جو گوشت کھاتا ہے اور ہڈیاں اسی
مقام پر چھوڑ جاتا ہے۔

میں نے اقبال رنگ والا سے پوچھا "اگر تم کو ایک ہزار روپے مل
جائیں تو کیا کرو گے؟"

"ایک ہزار روپے!" میں نے اس کی مسکراہٹ میں طنز سی سنی۔ "تم ایک
ہزار کی باتیں ذکر کر رہے ہو جیسے ایک چٹکی یا ایک ٹھوکا ۔۔۔۔ موجودہ گرانی میں ایک
ہزار کی کیا اہمیت ہے۔ کوئی اچھی لپ اسٹک تو کیا اگر بڑا مال بھی نہیں مل سکے گا۔ ہاں ایک
ہزار ڈالر ہوتے تو کچھ سوچا جا سکتا ہے۔"

"بات روپے یا ڈالر کی نہیں۔" میں نے اس کو سمجھایا۔ "میں تو
صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جو رقم مال غنیمت کے طور پر مل جاتا ہے اس کا تم کیا
کرتے ہیں۔"

اس نے میری بات ان سنی کر دی اور بولا "ایک بات بتاؤں اگر
تم کو ایک ہزار مل گئے ہیں تو میری مانو، کچھ اعلیٰ قسم کے شیڈس بھابی کے ناخنوں
اور لبوں کے لیے خرید لو۔ کبھی نہ کبھی کام آئیں گے۔ بھابی بھی خوش اور تم
بھی ۔۔۔۔!"

اقبال رنگ والا جس ٹائپ کا آدمی تھا اسی انداز کا مشورہ دیا تھا۔
میں نے فون رکھ دیا۔ عین اسی وقت میری سنگھ کا فون آ گیا۔ میری سنگھ میرے ہی
آفس میں کام کرتا تھا۔ جونیئر تھا لیکن مجھ سے بے تکلف تھا۔ خوف خدا رکھتا تھا اور
خیال دنیا بھی۔ گلے گلے تک کسی برائی میں ملوث نہیں تھا لیکن کبھی کبھی موقع ۔۔۔۔
اب چھوٹی چھوٹی کمزوریاں کس انسان میں نہیں ہوتیں۔ میں نے اس کو سارا ماجرا
سنایا۔ پہلے وہ ہنسا اور پھر بولا "آج میرا بھی آفس جانے کا موڈ نہیں تھا۔ سوچا
تھا کہ آپ کے ساتھ دن گزاروں۔ بھگوان نے میری سن لی۔ آ جائیے بیرا آپ
کا اور پروگرام ہمارا۔"

ہم خیال لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ میں نے ذرا سا بھی تامل
نہیں کیا اور فوراً گھر سے نکل گیا۔ پروگرام کے مطابق آئی میکس سینما ہال پر میری
سنگھ میرا منتظر تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور دوست حیدر مرزا بھی تھا۔ دو سو روپے
کا ٹکٹ لے کر ہم نے انگریزی فلم دیکھی۔ وقفہ میں مشروب سے بھی شغل کیا۔
تین سوا تین گھنٹے آسانی سے گزر گئے تھے۔ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو شام ہو رہی تھی
اور میری جیب میں ابھی چھ سو روپے موجود تھے۔

وہاں سے نکل کر ہم تینوں ہانگ کانگ ریستوران چلے آئے۔ ہانگ کانگ
ایک چینی ریستورنٹ تھا۔ چھوٹا سا لیکن نہایت ہی خوبصورت ۔۔۔۔ کھانے بھی
بہت عمدہ ملتے تھے۔ اس ریسٹورنٹ کا مالک لی چانگ ہم سے واقف تھا۔ کبھی اگر
وہ ہم کو دیکھ لیتا تو بل میں دس فیصد کا ڈسکاؤنٹ بھی کر دیتا تھا۔

مینو میری سنگھ نے دیکھا۔ کھانے پینے کا آرڈر بھی اسی نے دیا تھا۔
کچھ دیر بعد ہماری میز پر ٹھنڈی بیئر اور جوس کے گلاس نظر آئے۔ جوس کا گلاس میری
جانب بڑھاتے ہوئے میری سنگھ نے کہا "آپ تو دوسری نعمتوں سے محروم ہیں!"

میں نے مسکرا کر جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ ہم نے اپنے اپنے گلاس کو
ٹکرایا۔ چیئرز کی صدا بلند کی اور پھر آج کی شام اس ان دیکھے شخص کی نذر کی جس کا
نوٹ مجھے ملا تھا۔ مشروب کے بعد سوپ آ گیا اور پھر گرما گرم ذائقہ دار چینی
ڈشیں ۔۔۔۔ ہم تینوں نہایت اطمینان اور فرصت سے کھانا کھاتے رہے اور
اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ باہر شام رات کی زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا چکی
تھی۔ کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد بھی چالیس روپے باقی بچ گئے تھے جو میں
نے ٹپ اور پھر ریسٹورنٹ کے باہر کھڑے ہوئے سیکورٹی کے نوجوان کی نذر کر
دیئے۔ میری سنگھ اور حیدر مرزا کے چہرے گہرے سرور میں ڈوبے ہوئے تھے۔

باقی: صفحہ نمبر 86 پر

باندرہ سگنل

دیپک کنول (ممبئی بھارت)

باولی کی سزا پوری ہوئی تھی اور اُسے جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔ اُسے اپنی رہائی پر خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش نہیں تھی بلکہ بے حد اُداس اور پریشان تھی۔ جیل سے باہر آکر اُسے باہر کی دنیا بڑی بے مروت اور بیگانی لگی۔ یہ وہی باولی تھی جو باندرہ سگنل پر بھیک مانگا کرتی تھی۔ یہ وہی باولی تھی جس نے اپنی چھاتیوں کی نمائش کر کے باندرہ سگنل پر ایک ہیجان پیدا کیا تھا۔ اُسکی اس فحاش حرکت پر کئی معزز شہریوں نے پولیس میں جب شکایت درج کرائی تب جا کے پولیس جاگی۔ پولیس نے باولی کو پکڑ کر آٹھ گھنٹے تھانے میں بٹھا کے رکھا اور پھر اُس کی نہ صرف سرزنش کی بلکہ اُسے متنبہ کیا گیا کہ وہ آئندہ اس قسم کی حرکتوں سے باز رہے ورنہ اُسے جنسی جذبات بھڑکانے کے سلسلے میں اندر کیا جائے گا۔ باولی خود ان حرکتوں سے آزردہ اور پشیمان تھی پر وہ کس کو اپنے دکھڑے سناتی۔ یہ سب کچھ وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنی ماں کے کہنے پر کر رہی تھی۔۔۔۔ اُسکی ماں بدرن، ماں نہیں ڈائن تھی۔ وہ اپنے زمانے کی ایک بدکار عورت تھی جس کی بدمعاشی کے چرچے آج بھی بستیوں میں عام تھے۔ اُس نے اپنی بیٹی کو بھی اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی جس پر وہ خود کبھی چلی تھی۔ یعنی بدکاری اور بدمعاشی کا بدنما پیشہ جسے اپنا کر وہ فخر اور انبساط محسوس کرتی تھی۔

باولی اس ذلت بھری زندگی سے خوش نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو اُس چڑیا کی طرح محسوس کر رہی تھی جسے کسی ظالم صیاد نے پنجرے میں قید کر کے رکھا ہو۔ وہ اس پنجرے کو توڑ کر نکل جانا چاہتی تھی۔ بس اسی کشمکش میں وہ ایک اجنبی کے پیار کے جھانسے میں آ گئی۔ باولی کو لگا کہ اس کی پیاسی زندگی کا امرت ہو مگر ہوا اسکے الٹ۔ اُسکا عاشق ایک دلال تھا جس نے اُس کے جسم کا سودا کر کے باولی کے بچپن کا خون کر دیا۔ باولی جسم فروشی کے الزام میں پکڑی گئی اور تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ اس حادثے نے اُسکی زندگی میں ایک طوفان لا کر رکھ دیا۔ اُسے مرد ذات سے بے انتہا نفرت ہو گئی۔

گو کہ اب وہ آزاد تھی مگر یہ آزادی اُسے کوئی خوشی نہیں دے پا رہی تھی۔ زندگی کی ایک بھول نے اُسے کتنی مشکلوں سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی تھی۔ پتہ ڈال سے ٹوٹ جائے تو راہگیروں کے بےرحم پاؤں اُسے روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ آج وہ ایک اجنبی شہر میں اکیلی اور تنہا تھی۔ اُسے کوئی راہ نہ کوئی راہبر نظر آ رہا تھا۔ وہ جائے تو کہاں جائے؟ اُسکی کوئی منزل نہ کوئی مقام تھا۔ آخر وہ کیا کرے کس سمت چلے۔ یہاں رہے گی تو پھر وہی بھوکی نگاہیں اُسے گھورتی، بھنبھوڑتی رہیں گی۔ وہ پل پل جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اُسکے ماتھے پر جو بدنامی کا داغ لگا تھا اُسے لے کر وہ یہاں کیسے جی پاتی۔ مردار خور گدھ کی طرح اُسکی بوٹی بوٹی نوچنے چلے آتے۔ وہ اپنی اُس عزت کو کھونا نہیں چاہتی تھی جسے وہ اب تک بچانے میں کامیاب رہی تھی۔۔۔۔۔ آبرو تو موتی کی آب ہوتی ہے۔ ایک بار آب اتر گئی تو پھر بے آبرو ہو کے جینے کا کیا فائدہ۔

اُس نے بہت سوچا۔ عقل کے گھوڑے ادھر دوڑائے اُدھر دوڑائے۔ انجام کار وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اُسے اپنے ماں باپ کے پاس ہی واپس چلا جانا چاہیے۔ اپنا مارے گا تب بھی چھاؤں میں ہی ڈال دے گا۔ بس یہی سوچتے سوچتے اُسکے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھتے گئے اور وہ ایک چالو ٹکٹ لے کر گھر جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئی۔ راستے میں وہ اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ کیا وہ اُسے قبول کر لیں گے؟ یہ سوال کن میں رہ رہ کے اُسکے دل میں ہول سا اٹھنے لگتا تھا۔ ماں سے وہ اتنی خوفزدہ نہ تھی جتنی خائف وہ اپنے باپ سے تھی۔ بدرو جب کبھی آپا کھو دیتا تھا تو وہ قیامت کی ساری حدیں پھلانگ جاتا تھا۔ کتنی بار وہ اُسکے ہاتھوں چار چوٹ کی مار کھا چکی تھی۔ ماں اُسے روکتی تو وہ اُسے مار ہی ڈالتا۔ مار کا خیال آتے ہی اُسکا بدن کانپنے لگا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے۔ اُس نے گھبرا کر اپنے پسینے پونچھ لئے۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ جب دل کو یہ اطمینان ہوا کہ کوئی اُسکی طرف نہیں دیکھ رہا ہے تو اُس نے راحت کی سانس لی۔

وہ جب گھر پہنچی تو گھر میں کہرام سا مچ گیا۔ بھائی تو اُسے دیکھ کر خوشی سے جھوم اُٹھے جب کہ بدرو اور بدرن ایسے سیاپا کرنے لگے جیسے انہیں باولی نہیں بلکہ باولی کی مرنے کی خبر ملی ہو۔ بدرن اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے بولی۔

"ہائے ہائے! آ گئی اپنا منہ کالا کر کے؟ مرنے چلی تھی تو لوٹ کے کیوں آ گئی۔ وہیں کہیں بیٹھ کر دھندہ کر لیتی تو ٹھیک تھا۔ یہاں آ کر اب ہماری چھاتی پر مونگ دلنے چلی آئی؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی دل بھرا نہیں جو منہ اُٹھا کے پھر چلی آئی۔ ہائے رے موا اسے موت کیوں نہ آئی۔"

بدرن اُسے کوستی رہی اور وہ آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگائے رہی۔ بدرو اس دوران سمندر کے پانی کی طرح بس کھولتا رہا۔ باولی تو اس انتظار میں تھی کہ کب باپ کا قہر اُس پر ٹوٹے۔ وہ تو بس اُسے غصیلی نظروں سے گھورتا رہا اور بیچ بیچ میں بیڑی سلگاتا رہا۔ جب بدرن کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو باولی نے روتے روتے سر نیہوڑائے ماں سے کہا۔

"ماں ہم سے بھول ضرور ہوئی مگر ہم تم سے قسم کھا کے کہتے ہیں ہم نے اپنی آبرو کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ ہماری عزت آج بھی اُتنی ہی پاک ہے جتنی یہاں سے جاتے وقت تھی۔ ہاں ایک خطا ہو گئی ہم سے۔ ہم ایک بھڑوے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے۔ ہم کو لگا تھا کہ وہ سالا حرامی ہماری نیا پار لگا دے گا مگر وہ تو مگرمچھ نکلا۔ ایک دم ٹھگ اور کمینہ سالا۔ وہ ہماری عزت کا سودا کر کے بیچتا تھا مگر مولا نے ہمیں عین وقت پر بچا لیا۔

''میرا نام سدھاکر ہے۔ میں مشہور فلم ڈائرکٹر اشوک جی کا
اسسٹنٹ ہوں۔ وہ ایک پکچر بنا رہے ہیں جس کا نام 'فٹ پاتھ کے
شہزادے' ہے۔''

''تو میں کیا کروں۔ تیرے ڈائرکٹر کی آرتی اُتاروں کیا۔ سالا جس
کو دیکھو انگلی پکڑتے ہی پونچھا پکڑنے لگتا ہے۔'' اُس نے بڑی رکھائی سے جواب
دیا۔ اُس کا جواب سن کر سدھاکر خفیف ہو کر اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔ اُسے یہ نہیں معلوم
تھا کہ یہ چھوکری پانچ ہاتھ کی زبان رکھتی ہے۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ چھوکری فلم
کا نام سن کر خوشی سے اچھل پڑے گی اور اُسے سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ یہ تو اتنی
بے مروت اور بد زبان نکلی کہ چائے پانی تو دور اُس نے اُسے اب تک ایک گلاس پانی
تک کے لیے نہیں پوچھا۔

باولی اُس پر ایک تحقیر آمیز نگاہ ڈال کر اٹھی اور کمر پر بل دے کر
تن تناتے ہوئے اپنے بھائیوں کے ساتھ نکل گئی۔ ایک پل کے لئے سدھاکر
سناٹے میں رہ گیا لیکن دوسرے ہی پل میں وہ تیزی سے اٹھا اور اپنے اصلی رنگ
میں آ کر باولی کے سامنے کھڑا ہو کر غصے سے اُبل پڑا۔

''اتنا بھاؤ کا ہے کو کھا رہی ہے؟ سالی تیری جیسی کتنی دیتی کے دائیں
بائیں گھومتی رہتی ہیں۔ فٹ پاتھ کی ہو! دیتی کو اتنا کیا سمجھتی ہے کیا جو دیتی
تیرے آگے پیچھے کتے کی مانند گھومتا ہے۔ سالی میں ممبئی کا باسی ہوں۔ تیرے
کو شرافت سے ملنے کو آیا تھا میں خواہ مخواہ آیا۔ میرے باس نے میرے کو تیرے
پاس بھیجا۔ تیرے کو فلم میں کام دلانے کے واسطے۔ لیکن تیرے یہ تیور دیکھ کے
میرے کو یہی لگتا ہے کہ تیرے نصیب کے کھڑکی دروازہ نہیں کھل سکتا ہے میں
کیا بولوں۔''

سدھاکر کی یہ جلی کٹی سن کر باولی کی گھگھی بندھ گئی۔ جب بیر کو ہوا
بیرل جاتے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب کے باولی نرم پڑ کے بولی۔

''بات یہ ہے کہ ایک فلم میں تم کو ایک رول کرنا ہے جو دن کے ایک
ہزار روپے ملیں گے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ یوں سمجھو پندرہ ہزار کا ہوگی۔
اگر کام منظور ہے تو ابھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں پر ڈائرکٹر صاحب
بیٹھے ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھا دیں گے۔ بولو چلتی ہو کیا؟''

باولی کو لگا جیسے وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو۔ جس ہزار روپے
کمانے کا خیال اُسے کبھی خواب میں بھی نہ آیا تھا۔ ایک غریب کے لئے دس ہزار
کی اہمیت وہی ہوتی ہے جو امیر کے لیے بائی پاس سرجری کی ہوتی ہے۔ وہ ابھی
تک اس حیرت سے باہر آ نہیں پا رہی تھی۔ دس ہزار کے رنگین سپنے جانے نہ جانے
وہ کس دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ سدھاکر نے اُسے اس طرح کھویا ہوا پایا تو اُسے
اسے ہلاتے ہوئے کہا۔

''اے کیا سوچنے لگی؟''

''ایک بات بتاؤ صاحب۔ کہیں تم مجھ کو اُلّو تو نہیں بنا رہے ہو؟ میری امت
ماننا صبر سے کہ ایک آدمی پہلے بھی ایسے ہی خواب دکھا کر ٹھگ چکا ہے۔''

''تیرے کو میں ایسا اُٹھائی گیرا نظر آتا ہوں کیا؟ تو ایسا کر میرے کو
اپنے ماں باپ سے ملا دے۔ میں اُن سے ہی بات کر لوں گا۔ تجھے بھی
اطمینان ہوگا اور مجھے بھی تسلی ہوگی۔''

وہ اُسے اپنی کھولی پر لے گئی۔ جب بدرن کو پتہ چلا کہ سدھاکر فلم
والا سیٹھ ہے تو پھر کیا تھا۔ بدرن اور نورا نے سدھاکر کے آگے اپنی پلکیں بچھا دیں۔ سر
آنکھوں پر بٹھایا اُسے۔ اُس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بدرن
بہت پرانی گھاگ تھی۔ وہ اس سنہری موقع کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ
ایک بار اگر اس کی بیٹی فلمی دنیا میں چھا گئی تو اُن کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔
اُس نے آنکھ بند کر کے نہ صرف سدھاکر کی ہر شرط قبول کی بلکہ اُسے دوسرے روز آفس
میں بھیجنے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ سدھاکر تو چلا گیا مگر بدرن اور نورا رات بھر سو نہ
سکے۔ کتنے سہانے خواب اُن کی آنکھوں میں لہراتے چلے گئے۔ انسان تو اُمید
فردا کے سہارے جیتا رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بیشتر اُمیدیں پوری ہونے
سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ اُمید و بیم کا یہ سفر انسان کے ساتھ ہی چلتا رہتا ہے
کیونکہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ سانس ختم تو سب کچھ ختم۔

باولی کا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا جس میں وہ پاس ہو گئی۔ اُس کا کنٹریکٹ
بنا جس میں ساری چیزیں طے ہو گئیں۔ ڈریس مین بادشاہ سے کہا گیا کہ وہ اسے نئی
ڈریس پہنائے۔ بادشاہ بھائی اس کمپنی کا بہت پرانا ڈریس مین تھا اور وہ کاریگری
کی باتیں کرنے میں ماہر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر ڈائرکٹر کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ فلم
انڈسٹری میں چاپلوسی کرنا بھی ایک لازمی فن ہے جس کی بدولت نکمے، ناکارہ بھی
پروڈیوسر کے سر پر بیٹھے رہتے ہیں کامیاب رہتے ہیں۔ بادشاہ نے جب باولی کو نیا
ڈریس دیا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔ آج کتنے سالوں بعد اُسے پہننے کو
ایک نیا لباس ملا تھا جب کہ آج تک وہ اُترن پہن کر ہی کام چلا رہی تھی۔
جب اُس نے پرانا لباس جسم سے اُتار پھینکا اور نیا لباس زیب تن کیا تو وہ اس لباس
میں اپنے آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند بدلی کی اوٹ سے
نکل آیا ہو۔ سبھی اُسے اس لباس میں دیکھ کر آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔
وہ واقعی اس لباس میں کافی حسین لگ رہی تھی۔

بادشاہ بھائی باولی کا یہ قربِ روپ دیکھ کر اس پر لٹو ہو گیا۔ اُس کی
قربت پانے کے لیے وہ اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہونے لگا۔ وہ اپنے دونوں
بھائیوں کی دیکھ ریکھ میں تھی پھر بھی بادشاہ گھڑی گھڑی آ کر اس کے پاس بیٹھتا۔ کبھی
اُس کا ہاتھ دبا دیتا، کبھی اُس کے کپڑے ٹھیک کرنے لگتا۔ یہ ڈرنگی سدھاکر کو کھلا جا رہی
تھی۔ اُس کا یوں باولی کے قریب بیٹھنا اُسے کافی ناگوار گزرتا تھا۔ ایک دن اُس سے
رہا نہ گیا۔ اُس نے بادشاہ پر جھونکل اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ جب شُوٹ کا ٹائم تھا اور سبھی

جذبات کو جگانا چاہتے ہو؟ کا بےحسی سے ساداوں کو کمزور کرنا چاہتے ہو۔ میں ایک بار ٹھوکر کھا چکی ہوں۔ میں اب دوسری بار ٹھوکر کھانا نہیں چاہتی ہوں۔"

سدھاکر نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر شدتِ جذبات سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں جس راہ پر قدم رکھنے جا رہا ہوں، اس راستے پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس راہ پر چلنا آسان نہیں پھر بھی میں اس راہ پر نکل پڑا ہوں۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ میرا یقین کرو میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ میں تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دوں گا۔"

پاولی کے بھی جذبات کے بند ٹیلے کے ساتھ بہنے لگی تھی تو کبھی وہ سختی سے اپنے جذبات کو دبانے لگی تھی۔ کسی کا دیا ہوا درد وہ ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ وہ پھر سے اُسی درد سے دوچار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسلئے اس نے سدھاکر کی پیش کش کو سختی سے ٹھکرا دیا۔ سدھاکر اُس کے اس فیصلے سے سکتے میں رہ گیا۔

شوٹنگ ختم ہوئی۔ پاولی پھر سے اپنے کام دھندے پر لگ گئی۔ اس بیچ سدھاکر نے اُس سے ملنے کی کوشش کی مگر اُس نے ہر بار اُسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ اُسے محبت کے لفظ سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ سدھاکر بھی اتنی جلدی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ پاولی سے ملتا رہا۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بالآخر اُس نے پاولی کو پھر سے رِجھا لیا۔ پاولی ایک کمزور جان جو سہارے کے لئے کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک رہی۔ سدھاکر کے وعدے، ارادے اور اُسکی دیوانگی دیکھ کر پسیج گئی۔ دونوں نے چوری چھپے شادی کر لی۔

وہ شادی کے بعد پاولی کو ولی کی طرح رکھنے لگا۔ بیوی کے یہاں بھی وہ ہر مہینے ایک موٹی رقم ڈال کر جاتا تھا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہو جائے۔ بچے اور نعم کو بھی اس نے سپاٹ ہوائے کے کام پر لگا دیا تھا۔ وہ خود والد اور بیوی کی نظروں میں چھا گیا تھا۔ اُن کے لیے وہ کسی مسیحا سے کم نہ تھا جس نے نہ صرف اُن کے دکھ درد کم کر دیئے تھے بلکہ انہیں عزت سے جینے کی راہ بھی دکھائی تھی۔ اس لیے پاولی اپنے فیصلے پر نازاں و فرحاں تھی۔

ایک دن سدھاکر پاولی کو سجا دھجا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ دونوں ہوٹل میں پہنچے۔ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو کر پاولی نے سراسیمہ ہو کر سدھاکر سے پوچھا۔

"یہ تم مجھے اِدھر کہاں لے کر آ گئے ہو؟"

"دیکھو ابھی جو آدمی آنے والا ہے وہ ایک نامور ہے۔ اگر تم اُسے خوش کر لو گی تو وہ مجھے ڈائریکٹر بننے کا چانس دے سکتا ہے۔ بس ایک رات اور پھر۔۔۔۔"

پاولی کو لگا جیسے اُس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ اُس نے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ سدھاکر کے گال پر رسید کیا اور پھر وہ اپنے ریزہ ریزہ دل کو لے کر ہوٹل سے نکل گئی۔ وہ پھر سے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔

☆

بقیہ: تتلیاں اور چوہے۔

"ایک ساتھ دو۔۔۔۔"

میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ اچانک ایک منی بس دوسری کو کاٹ کر دندناتی چلی آئی۔

جانے مجھے کیا ہوا، پستول لڑھک گیا!

میں تیزی سے لپکا اور بچی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

بچی کی ماں دھکے سے سڑک کی دوسری طرف لڑھک گئی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بچی کو میرے ہاتھ سے لے کر بھینچ لیا۔

ہجوم دم بھر کو ساکت ہو گیا۔ منی بس والوں کی تیز رفتاری پر انہیں گالیاں بکیں اور پھر سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔

بچی ماں سے چپکی ہوئی اور بڑی حسرت سے اپنی آئس کون کو میلے کیچڑ میں گھلتے دیکھے جا رہی تھی۔

میری نگاہیں بھی آئس کون پر جمی تھیں۔ سفید ٹھنڈا اور میٹھا میرے لیے کیچڑ کو کھانا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

میں گندی گلی میں سے ہو کر بڑی والی سڑک پر نکل آیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے ذہن میں پلنے والی تتلیاں اور چوہے غائب ہو گئے ہیں۔

انہیں آئس کون کا سفید دودھ نگل گیا۔

بقیہ: بے باق۔

مجھے بھی ایسی ہی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے سقا کو ایک دن کی بادشاہت میں چمڑے کا سکہ جاری کر کے محسوس ہوئی ہوگی۔

رخصت ہوتے وقت حمید مرزا نے میرا شکریہ ادا کیا اور میری نگہ بولا "مجھکو وہ جگہ بتا دیجئے جہاں آپ کو ایک ہزار کا نوٹ ملا تھا۔ میں کل وہاں اپنی قسمت آزماؤں گا۔"

ہم تینوں کھلکھلا کر ہنس دیے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گھر کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا نظر آیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میری نو سالہ بچی فرح کا چہرہ فق تھا۔ میری دس سالہ دلہن نے معمول کے مطابق میرا استقبال نہیں کیا تھا۔ میں نے فوراً پوچھا "آپ لوگ سست دکھائی دے رہے ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے نا؟"

بچی نے ماں کا چہرہ دیکھا اور ماں نے میرا چہرہ اور کہا۔ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ "آپ کی بچی نے ۲۲ سو روپے جو اسکول کی فیس ادا کرنے کے لیے آپ نے دیئے تھے کہیں کھو دیئے ہیں۔"

میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کا نصف حصہ چھپا لیا تھا۔

☆

یُوسفِ بے کاروار

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

پرانے وقتوں میں 'موسم اور ہواؤں کے ساتھ کچھ لوگوں کی پرانی چوٹیں اور زخم ہرے ہو جایا کرتے تھے جن کا زیادہ تعلق انسانی جسم کے سخت ترین حصے یعنی ہڈیوں سے ہوا کرتا تھا۔ مگر دلوں کی چوٹ پرانی ہواؤں کی محتاج ہوتی ہے نہ کسی اور نہ موسم سے متعلق جن کی قسمت میں درد کی چوٹ بنا لکھ دیا گیا ہو وہ ہر حال میں قسمت کا لکھا بھوگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ایک دکھ ایک بیماری' ایک روگ نہ جانے کتنے موسموں اور نسلوں سے ہمارے نصیب میں چلا آ رہا ہے جس کا کوئی علاج ہے اور نہ حل۔ بس کڑھتی جاتی ہے شناخت رہیں نہیں' نہ کسی اس جرم کی بابت تو کچھ معلوم ہو جس کے کارن صدیوں سے ہم سزاوار چلے آ رہے ہیں۔

زمانہ بدل گیا' سائنس نے بے پناہ ترقی کر لی' انسان کی ہر ابتلا کا کوئی نہ کوئی علاج دریافت ہو چکا مگر ایک دقت پھر بھی ہے جب بھی مسیحائی کی امید لے کر کوئی مریض معالج یا طبیب کے روبرو حاضر ہوتا ہے تو سب سے دشوار گزار مرحلہ مرض کی تفصیل اور اس کی علامات کا بیان ہوتا ہے۔ کچھ دن مریض کو ماحول کی نامانوسیت کر دیتی ہے کچھ معالج کا کروفر اور اس کی ڈگریوں کا شمار۔

یہ کلینک بھی صفائی ستھرائی اور نفاست میں دیدنی ہے۔ ہر سبزہ سج لان' جدید راہداریاں' رنگ برنگے خوشنما پھول' سرو قد پودوں کے درمیان کشادہ کار پارکنگ میں جدید ماڈل کی بیش قیمت گاڑیاں میری وحشت میں اضافہ کا باعث بن رہے ہیں۔ میں کلینک کے صدر دروازے پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ بیماری اور اس کے اثرات کا تعین کرنے میں مجھے دشواری پیش آ رہی ہے۔ ایک مسئلہ زمان و مکان کا بھی ہے۔ بیماری کا سراغ ڈھونڈتے' تلاش کرتے دس بیس پچاس کبھی سینکڑوں سال پیچھے بھی جانا پڑتا ہے۔ سر دست سب سے اہم مسئلہ کلینک کے اندر جانا اور ڈاکٹر کے سامنے حال دل بیان کرنا ہے۔ سنا ہے سائنس والے دل کی دلیل کے قائل نہیں ہوتے۔ اپنی توجہ بٹانے کے لئے کلینک میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا ہوں۔ سب چہرے متفکر' پریشان اور نا آسودہ ہیں۔ جب بھی ڈاکٹر کی خوش شکل پی اے کا انٹرکام بجتا ہے میرے دل کی دھڑکن تیز تر ہو جاتی ہے میرے گرد و پیش بیٹھے ثروت مند مریضوں کے چہروں کا تناؤ کم ہونے لگتا ہے۔ سب کے سب امید افزا نظروں سے دھان پان پی اے کی جانب دیکھنے لگتے ہیں حالانکہ سب کا وقت اور باری مقرر ہے۔ ان سب میں شاید واحد مریض میں ہوں جسے ڈاکٹر کے پاس جانے کی قطعاً کوئی جلدی نہیں۔ میرے دل میں اس وقت شدید خواہش ہے کہ ڈاکٹر کو ارجنٹ کام پڑ جائے یا ہسپتال سے ایمرجنسی کی اطلاع پا کر فوری طور پر تمام مریضوں' کم از کم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا جائے۔ ان خیالات کے باعث میں کسی قدر شرمندگی کا شکار ہوں کیونکہ میرے اہل خانہ اور دوست میری روز بروز گرتی صحت کے باعث بہت متفکر اور پریشان ہیں۔ ان لوگوں کی یہی فکر مندی مجھے شہر کے مہنگے ترین ہسپتال تک لے آئی ہے۔

گھر والوں کو سمجھایا اور بتایا بھی جا سکتا ہے کسی حد تک وہ میری نازک حالت سے باخبر بھی ہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور میرے دوست اس باب میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ سب کے سب میرے لئے ڈھیروں پھل پھول لے کر آتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ میں ان کے لائے پھل ضرور چکھوں اور پھولوں کے خوبصورت گلدستوں سے دل بہلاؤں اور ہر قسم کی فکروں سے دور رہوں۔ کتنے سادہ ہیں میرے دوست! بلی کی آمد پر چوہے کو آنکھیں بند کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ان کی معصومیت' بے خبری اور لاچاری پر مجھے! کبھی پیار کبھی غصہ اور کبھی رونا آتا ہے۔ کتنی محبت کرتے ہیں یہ سب مجھ سے اور اسی محبت میں اندھے ہو کر میرے لئے منہ مانگی قیمت پر شفا خریدنے کے آرزو مند ہیں۔ میں جانتا ہوں! میرے مرض کا علاج ہرگز اس ہسپتال میں دستیاب نہیں' یہاں بیٹھنے والا شہر کا قابل ترین ڈاکٹر انسانی جسموں کا ماہر ہے جبکہ میری روح زخمی ہے۔ ان زخموں کا علاج وہی کر سکتا ہے جس نے یہ زخم لگائے ہیں مگر وہ انسانی عارضوں کی نسبت اپنے مفادات کا اسیر ہے۔

ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا ہے کئی بار میرا وجود مہلک و موذی امراض کا گڑھ بنا ہے۔ کئی بار میرے وجود کے قیمتی حصے ایک دوسرے سے جدا کئے گئے ہیں۔ کئی بار مجھے اپنے ہی خون سے غسل کرایا گیا ہے اور نہ جانے کتنی بار مجھ پر زمین تنگ کی گئی ہے۔ میرے جذبات امڈ رہے ہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر بہت کچھ کہنا اور بتانا چاہتا ہوں مگر وہ دیکھئے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز خوش شکل پی اے کا انٹرکام پھر بج اٹھا اس بار ڈاکٹر کے کمرے سے ایک چاق و چوبند نرس برآمد ہوئی ہے لگتا ہے اب کی بار اس کا نشانہ میں ہوں۔ وہ سیدھی میری جانب بڑھی چلی آ رہی ہے

میرے بائیں جانب بیٹھے لوگوں میں ہل چل ہو رہی ہے۔ ادھیڑ عمر اور
لاغر جسم کا مالک مریض ان کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اسے سہارا دے کر
ڈاکٹر کے کمرے سے برآمد ہونے والی نرس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ نرس
نے اپنا مونڈھا مریض کی بغل میں دے کر اس کا ہاتھ اپنے دوسرے
کاندھے پر رکھ لیا ہے۔ اب وہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر کے کمرے کی جانب
گامزن ہے۔ مجھے نہیں یقین کہ یہ بے چارہ اپنی ہمت یا ڈاکٹر کی چارہ
گری کے سہارے جانبر ہو سکے گا۔ میں نے اس کا عزم متزلزل ہوتے دیکھا
ہے..... پھر باقی کیا بچا! کچھ بھی نہیں، سب بیکار ہے دیمک لگی لکڑی کی
مانند۔

کہتے ہیں! جوانی کی بیماری پر جلد قابو پایا جا سکتا ہے مگر جو
مریض عین شباب کے عالم میں جراحت کے بڑے عمل سے گزر کر قطع برید
سے دوچار ہو چکا ہو وہ بیماری کے ہلکے جھٹکے کیونکر سہہ سکے گا جبکہ اس کی
بیماری کا تعلق داخلی سے زیادہ خارجی ہے جس کے حملوں سے قبل احتیاطی
تدابیر سے بھی سر مو انحراف کیا گیا ہو اور آنکھ بند کر کے عارضی دواؤں پر
اعتماد کیا جاتا رہا ہو۔

جب بھی میری بات نکتے پر آنے لگتی ہے میرا شکم مداخلت
کرنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر کی پی اے کو اپنی جانب متوجہ پا کر میرے حلق میں
کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ کتنے کول اور مدھر سُروں میں اس نے میرا نام پکارا
ہے۔ لگتا ہے میری آخری خواہش معلوم کر رہی ہے۔ کاش! میں اس وقت
تنہا ہوتا تو اپنے نام سے منحرف ہو جاتا مگر اس وقت میرے سارے ہمدرد و
غم گسار لپک کر میری جانب بڑھے ہیں وہ سب کے سب میرے ہمراہ
ڈاکٹر کے کمرے میں جانے پر بضد ہیں نرس کی تنبیہ انہیں سرکشی پر آمادہ کر
رہی ہے۔

"یہ کیفیت کب سے ہے آپ کی؟" دل، جگر، معدہ،
پھیپھڑے، آنتوں کے ماحول سے لے کر آنکھوں کی پتلیوں تک چیک کرنے
کے بعد پر وقار تاثر کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پہلا سوال کیا۔

"بار ہا تلاش کرنے پر بھی میں اس کے سرے تک نہیں پہنچ
پایا۔ قریب پانچ دہائی قبل ایسا ہی ایک کلینک تھا جس میں جا بجا مختلف
کمروں کے بجائے ایک بڑا ہال نما کمرہ تھا۔ سیمنٹ کے بنے فرش پر دو
رویہ لکڑی کے بنچ پڑے ہوئے تھے۔ زنانہ اور مردانہ قطاروں میں غریب
اور متوسط لوگ اپنی باری کے منتظر تھے۔"

"کیا تکلیف ہے جوان۔"

ہال نما کمرے کے ایک کونے میں بڑی سی میز کے ایک طرف
چھت سے ٹنگی لالٹین لکڑی کی کرسی میں دھنسے بھوپال سنگھ نے پگڑی کا طرہ
درست کرتے ہوئے دادا جان سے پوچھا تھا۔

"جناب! اس کی بھوک مرگئی ہے" دادا جان کے ایک پرجوش
دوست نے کہا تھا۔

"یہ کمزور بہت ہو گیا ہے جناب" دوسرے نے عجلت سے
بتایا تھا۔

"اس کو نیند بھی نہیں آتی" ڈاکٹر صاحب! یہ راتوں کو اکثر
جاگتا ہے اور نہ جانے کیا سوچتا رہتا ہے" تیسرے دوست نے
بات کو آگے بڑھایا تھا۔

"بھوک مرگئی ہے، کمزور ہو گیا ہے، راتوں کو جاگتا رہتا ہے
"کاکو" یہ بیماری نہیں، بیماری کے اثرات ہیں۔" بھوپال سنگھ نے خوشدلی
سے کہا تھا۔

"تو بتا "جوان" ماجرا کیا ہے۔ عشق وشق کا چکر تو نہیں، ذرا
بالکل صاف برخوردار سچ بتا دے میں کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔"

"کس چیز کا....." دادا جان نے حیرت سے بھوپال سنگھ کی
جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تیری بیماری کا، تیرے مسئلے کا اور کس چیز کا پتر۔"

"میرے ذہن میں پروان چڑھنے والے خدشات مٹا
دیجیے۔ تعصب، تنگ نظری اور فسادات ختم کروا دیجیے..... ڈاکٹر صاحب!
بے گناہ انسانوں کا بہتا خون بند کروا دیجیے۔"

"بھئی مریض کا بڑا کوئی ہے..... مجھے تو یہ انقلابی قسم کا لیڈر
ویڈر لگتا ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ تو بہت شریف آدمی
ہے پتا نہیں اسے آج کل کیا ہو گیا ہے۔ مسجدوں، مندروں، مزاروں حتیٰ کہ
گلی کوچوں کے در و بام کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا اور سوچتا ہے کیا
ہے اپنے بزرگوں کی یہ نشانیاں مجھے اجنبی لگنے لگی ہیں۔ دادا جان کے ایک
پختہ کار دوست نے رقت آمیز انداز میں ڈاکٹر بھوپال سنگھ کو ان کی حالت
کے بارے میں بتایا تو بھوپال سنگھ اسی طرح ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا
تھا جس طرح اس وقت آپ بیٹھے ہیں۔"

"او..... ہوں..... زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے صرف اتنا
بتایئے کہ بھوپال سنگھ نے آپ کے دادا جان کا کیا علاج تجویز کیا تھا اور
کتنے عرصے میں وہ صحت یاب ہوئے تھے۔"

"وقت اور زمانے کی چال بالکل نہیں بدلی ڈاکٹر صاحب!
ہم نے تاریخ سے سبق سیکھا ہے اور نہ تاریخ سازوں نے قدرت سے،
سب کچھ اسی طرح جاری و ساری ہے۔ استحقاق سے بڑھ کر حاصل کرنے

کی خواہش ختم ہو جاتی تو شاید دادا جان بھی صحت یاب ہو جاتے اگر دادا جان صحت یاب ہو جاتے تو ڈاکٹر چڑجی کو گھر سے ہماری خاندانی کیس ہسٹری نہ ہیرا پڑتی' گھر سے والد صاحب کو تختۂ مشق نہ بنانا پڑتا؟"

"ڈاکٹر چڑجی...... کیس ہسٹری...... والد صاحب...... یہ کب کا قصہ ہے۔"

"یہ کوئی ربع صدی قبل! بہت بڑا' بہت حسین' ہرا بھرا' پرسکون' سادہ و خوبصورت سے طرز پر گھر تھا ہمارا' چاروں اُور وسیع و دیا بلند و بالا پہاڑ خوبصورت جھرنے اور شفاف ندی نالے بہتے تھے۔ بستیاں اور بازار پُر رونق اور ضروریات زندگی عام تھی جن میں بسنے والے سادہ اور سچے انسان' ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار' ہمیشہ ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا عزم رکھنے والے محبت بھرے دلوں کے ساتھ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ بہتر مستقبل کی جانب گامزن تھے۔ نہ جانے کس ہوس پرست نے ہمارے ہرے بھرے گلشن میں نفرت کا زہریلا بارود پھیلا دیا جس کے خوفناک شعلے ہمارے گھر کو خاکستر کر گئے' اس بارود کے پھٹنے سے بہت پہلے اس کی بو والد صاحب کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی اور وہ آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے۔ ڈاکٹر بھوپال سنگھ کی طرح ڈاکٹر چڑجی بھی بے بس ثابت ہوئے تھے وہ بھی والد صاحب کے بہت سے دوستوں اور محبت کرنے والوں کی دعاؤں کے باوجود انہیں بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

آپ بھی وقت ضائع مت کیجئے ڈاکٹر صاحب---- آندھیاں بہت تیز اور میرا وجود بے بضاعت سا ہے؟

آرے اور چھریاں' گھر سے! تیز کی جا رہی ہیں۔ گھر سے عالمی سامراج بے گناہ انسانوں کو کاٹنے' بانٹنے اور ان کے منہ کا نوالہ چھیننے کی فکر میں ہے؟ گھر سے مجھے میرے در و بام نامانوس لگنے لگے ہیں؟

نہ جانے کیوں؟ مجھے اس وقت 'شیکسپیئر' شدت سے یاد آ رہا ہے کہا تھا دنیا ایک اسٹیج ہے ہر کوئی باری پر اپنا کردار ادا کر کے چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں آنے والے وقت کا شیکسپیئر کو ادراک نہ تھا وہ حرص و ہوس کے خداؤں کے اس کھیل سے قطعی لاعلم تھا جس نے دنیا کے حسین اسٹیج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کے ایک طرف خوش بختی اور خوشحالی کا دور دورہ ہے اور دوسری جانب آگ و خون کا کھیل جاری ہے اور اس کھیل کے بیشتر کردار ہمیشہ کی طرح جانے پہچانے اور شناسا ہیں؟

مقام شکر ہے کہ اس اسٹیج کا نام کرۂ ارض ہے جس کی گردش ابھی تھمی نہیں۔

میں کیوں کر نظم لکھتا ہوں

ممتاز احمد ([illegible])

مجھے آمد نہیں ہوتی
میری آورد ہوتی ہے
اسی آورد کے بل پر
میں اکثر شعر کہتا ہوں
یا کوئی نظم لکھتا ہوں
میں جب اشعار لکھتا ہوں
طبیعت میں مسلسل
ایک بے چینی سی رہتی ہے
میں راتوں کو بھی اُٹھ اُٹھ کر
کتابیں کھول لیتا ہوں
کسی شاعر کا اِک مصرعہ
اچھوتی سوچ کا حامل
میری روح میں اُترتا ہے
کسی کاغذ کے پُرزے پر
میں لکھ کر گنگناتا ہوں
میں پہروں سوچتا ہوں تب کہیں جا کر
اُسی جیسا [illegible] کوئی اِک مصرعہ
میں خود کہہ کر
مکمل شعر کرتا ہوں
کبھی تو بات بنتی ہے
مگر اکثر نہیں بنتی
میں یوں اشعار کہتا ہوں
میں ایسے نظم لکھتا ہوں

اُجالوں سے تکرار

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا، بھارت)

اُجالوں سے تکرار کرتے رہو — ہمیں بھی طرف دار کرتے رہو
فضا میں ہے تہمت کی چنگاریاں — محبت سے انکار کرتے رہو
کہیں اور جانے کی سوچے نہ وہ — اُسے اسقدر پیار کرتے رہو
ہوس کی دکانیں ہیں ہر موڑ پر — گلوں کو بازار کرتے رہو
کسی کی بھی تنقید سے مت ڈرو — جو دل نے کہا' پار کرتے رہو
بلندی کی دُھن ہے تو تھکنا نہیں — جنوں کو طلب گار کرتے رہو
تمہیں کوئی جاوید کچھ بھی کہے — شرافت کا اظہار کرتے رہو

صابر عظیم آبادی (کراچی)

نگاہوں میں برابر جل رہا ہے — ترے چہرے کا منظر جل رہا ہے
لگا ہے داغ جو قرطاسِ دل پر — مرے سینے کے اندر جل رہا ہے
ہوائے مشکبو کا ہاتھ کب سے — ترے عارض کو چھو کر جل رہا ہے
لگی ہے آگ یہ کیسی چمن میں — سراپائے گلِ تر جل رہا ہے
عجب منظر ہے اپنی بے بسی کا — بھری برسات میں گھر جل رہا ہے
وفا کی غیر معمولی تپش سے — ترا بازو مرا پر جل رہا ہے
خود اپنی آگ میں اے مہر تاباں — مسلسل تیرا پیکر جل رہا ہے
ہوا رہتے ہوئے بھی رہ گزر میں — دیا ہر گھر کے باہر جل رہا ہے
ہوس کی آگ میں برسوں سے صابر — مقدر کا سکندر جل رہا ہے

شباب للت (شملہ، بھارت)

خوب ہم سے چال چل گئے — ہم وہی ہیں' تم بدل گئے
ہم بجھے تو کیا بُرا ہوا — کچھ نئے چراغ جل گئے
جس گلی میں ٹھوکریں ملیں — ہم اُسی میں سر کے بل گئے
میرے ذکر پر تڑپ اٹھے — مجھ کو سوچ کر پگھل گئے
اک جلی فضا میں گھل گئی — سینکڑوں چراغ جل گئے
اُس نظر نے آسرا دیا — گر چلے تھے ہم سنبھل گئے
اہلِ زر کی واسنا کے ہاتھ — کتنے چندرماں نگل گئے
شرم سے وہ رُخ ہوا گلاب — منہ سے کیا بچن نکل گئے
جس کو چھو گئی تری نظر — اُسکے سارے پاپ جل گئے
نقطے پر نگاہ جم گئی — دائروں سے ہم نکل گئے
پیار کے گگن پہ جب اُڑی — واسنا کے پنکھ جل گئے
ہم تھے سنگ اُس نے جب چھوا — پیکرِ بشر میں ڈھل گئے
ہم تھے اے شباب اہلِ فن — دھول کھا کے پھول اُگل گئے

رب نواز مائل (کویت)

ہے فطرت میں خطا تو ہو خطا بھی — مگر بھولیں نہ بخشش کی دعا بھی
نجانے کیا سنا اُس راگ سے یُوں — جو کب کا بج چکا میں پہ بُرا بھی
وہ جس بابت کہ سب تھے خوف میں گم — وہانہ تھا کوئی کیا فِس رہا بھی
جہاں ملنا بھی تھا جوں خوابوں ہی میں — وہ کس معنی میں تھا کیا را بطا بھی
یہ چلتا اب کے ہو اپنا نہ اپنا — کہ گویا جاں گئی گر کچھ رکا بھی
جو اُٹھنا بیٹھنا تک بھی نہ تھا اِک — سو کیسے تھے بہر تُو ہم جُدا بھی

○

خالد ندیم (بدایوں بھارت)

جواں ہیں حوصلے پاگل ہوا کے — بہت خوش ہے چراغوں کو بُجھا کے
بہت اکرام ہوں ہم پہ خدا کے — اگر آداب آجائیں دُعا کے
بدل پائے نہ تم تیور وفا کے — ملا کیا راہ میں کانٹے بچھا کے
اُنھیں کو غیر ممکن ہے مٹانا — تصور میں جو بن جاتے ہیں خاکے
پیا تیزاب جب سے زندگی کا — ہم عادی ہوگئے کڑوی دوا کے
چراغوں کو ابھی روشن نہ کیجیے — بڑے بے رحم ہیں جھونکے ہوا کے
کوئی مجبور دستک دے رہا ہے — ذرا دیکھو تو دروازے پہ جا کے
جنھیں برباد کرتا ہے زمانہ — اُنھیں بھی دیکھیے نزدیک لا کے
بڑے محفوظ گوشے ہیں جگر میں — تری خوشبو کو رکھا ہے چھپا کے

○

نوید سروش (میرپور خاص)

جب کوئی دریچہ نہ پرندہ نہ شجر ہے — سوچو کہ یہاں کس طرح پھر زندہ بشر ہے
اُس سمت کشش کون سی لے جاتی ہے تم کو — یادوں کے جزیرے میں جو ویران سا گھر ہے
اندازہ یہیں ہوتا ہے سنسان کھنڈر سے — یہ بھی کوئی تاریخ کا آباد نگر ہے
ہاتھوں میں صداقت کا علَم لے کے چلا ہوں — ہر گام مری منزلِ مقصود پہ نظر ہے
جو صورتِ خورشید تھا دنیائے ادب میں — اخبار میں اُس شخص کے مرنے کی خبر ہے
تم ' قہقہے' نہ چائے کی پیالی نہ کوئی پھول — ویران سے گھر میں بس ایک سوکھا سا شجر ہے
یہ نام یہ عزت جو مجھے دی ہے خدا نے — ماں باپ کی بے لوث دعاؤں کا اثر ہے

○

اُفق دہلوی (دوحہ)

جیت کر دل اُن کا اُن کو پالیا — بن رہے تھے غیر انھیں اپنا لیا

وہ نہ سمجھے تھے نہ سمجھے دل کی بات — نا سمجھ تھا دل اُسے سمجھا لیا

میں نے فیض اوروں کو پہنچایا بہت — آپ اپنے کو ضرر پہنچا لیا

کر لیا یاروں کی یاری پر یقیں — دیدہ و دانستہ دھوکا کھا لیا

یہ تو پوچھے جانے والے سے کوئی — کیا دیا تم نے کسی سے کیا لیا

راہ پر اپنے تھا رہرو کو ناز — پوچھتے منزل کو اپنی پالیا

بوند پانی کی فلک نے جب نہ دی — دیدۂ خوں بار کو برسا لیا

کوئی باقی ہو تو ڈھالے وہ ستم — ہر ستم تو نے ستمگر ڈھا لیا

ڈھونڈتے ہی رہ گئے شاعر جسے — وہ نیا مضموں اُفق نے پالیا

○

طالب انصاری (واہ کینٹ)

دل سے ہر غم نکال رکھا ہے — خود کو مشکل میں ڈال رکھا ہے

ورنہ میں کب کا گر گیا ہوتا — حادثوں نے سنبھال رکھا ہے

میرے اندر کی وحشتوں نے مجھے — گھر سے باہر نکال رکھا ہے

گرچہ بے نام سا سہی پھر بھی — تجھ سے رشتہ بحال رکھا ہے

انتہائے کمال سے آگے — کچھ نہیں ہے زوال رکھا ہے

قہقہوں کے دروں میں بھی جھانک — دیکھ کتنا ملال رکھا ہے

ضبطِ گریہ کا شکریہ جس نے — میرے دکھ کا خیال رکھا ہے

شدتِ انتظار نے مجھ کو — ایک پتھر میں ڈھال رکھا ہے

رزق بر حق سہی مگر طالبؔ — رزق کے ساتھ جال رکھا ہے

○

جاوید شیخ (میرپورخاص)

جب سمندر ہی اپنا گھر ٹھہرا — اپنا ہر راستہ بھنور ٹھہرا

جب اندھیروں نے رُخ کیا دل کا — داغِ دل صورتِ قمر ٹھہرا

ذہن کو وسوسوں نے گھیر لیا — وہ نہ جب مجھکو دیکھ کر ٹھہرا

جس کو کرتے تھے کل نظر انداز — آج وہ مرکزِ نظر ٹھہرا

مدتوں بعد جو ملا مجھ کو — وہ مرے پاس لمحہ بھر ٹھہرا

○

حمیرا راحت (کراچی)

کبھی کمرہ کبھی در بولتا ہے — عجب سی بولیاں گھر بولتا ہے
مرے نزدیک آ کر دھیان سے سن — مرے اندر سمندر بولتا ہے
اِک آنسو ہے جو کچھ کہتا نہیں ہے — مگر اِک درد اکثر بولتا ہے
حمیرا عشق کا غم ہو نہ جائے — بری آنکھوں میں یہ ڈر بولتا ہے
بدلتی جا رہی ہے اب روایت — لہو خاموش، خنجر بولتا ہے
نہیں دیکھا جو آنکھوں نے ابھی تک — وہی نادیدہ منظر بولتا ہے
مسلسل بولتا رہتا ہے کوئی — کوئی خاموش رہ کر بولتا ہے
کبھی اک گونگا سناٹا راحت — ہمارے بیچ آ کر بولتا ہے

تصور اقبال (پنڈی گھیب)

لمبی تان کے اب سو جا — پتھر کی مورت ہو جا
تن کی چادر میلی ہے — پہلے تو اس کو دھو جا
نفرت سے دل کالے ہیں — بیج محبت کے بو جا
میرے بعد نہ رونا تو — جتنا رونا ہے رو جا
تیرے حق میں بہتر ہے — شام ہوئی ہے گھر کو جا
میرے ہونے میں ہونا — مجھ میں تو ایسے کھو جا
پہلے تو کچھ کم تھی کیا؟ — اور قیامت سی ہو جا
یا اس عشق کو رہنے دے — یا سچا عاشق ہو جا
بستی والے سو گئے ہیں — یار تصور اب سو جا

عرش صہبائی (جموں کشمیر)

جل سکوں خود سے یہ ارادہ ہے — وقت کم ہے سفر زیادہ ہے
مجھ کو لانا نہیں یہ خاطر میں — دل بھی کوئی رئیس زادہ ہے
کس قدر خوش لباس ہے دنیا — ایسے لگتا ہے بے لبادہ ہے
وہ ہے تحلیل میری رگ رگ میں — پھر بھی اُس کی کمی زیادہ ہے
بھول جاتا ہے ہر وفا میری — وہ طبیعت کا کتنا سادہ ہے
میں کہ ہوں بے نیاز ہر غم سے — میرا جو غم ہے وہ بھی بادہ ہے
اُس کی ہلکی سی مسکراہٹ میں — لطف کم ہے ستم زیادہ ہے
ہونٹ اس کے باہر کا موسم — اُس کی آنکھیں کہ رقص بادہ ہے
ہر ستم سے نوازتا ہے مجھے — دل کا وہ کس قدر کشادہ ہے
دل میں اس کے لیے کشش ہے عرش — یہ میرا جرم ہے بے ارادہ ہے

مرے نغمے سے تو بکھرے شانے پائے
لے سکھی سائے جا سکھی ساجن
کر دیا میری سوزشِ دل نے
تختۂ گل کو آتشِ گلخن
تھا نشانِ بہار میں شامل
اک ہمارا بھی تارِ پیراہن
اور کیا ہوگی نذرِ دل اے دوست!
اک غزل اک نوائے ساز شکن

"ردیف" فارسی غزل کی ایجاد ہے۔ عربی غزل میں قافیہ ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شفیع کدکنی کتاب فارسی "موسیقی شعر" میں صفحہ نمبر 111 پر لکھتے ہیں "بہ طور قطع می توان ادعا کرد کہ حدود ہشتاد درصد غزلیات خوب زبان فارسی ہمہ داری ردیف ہستند و اصولاً غزل بی ردیف بہ دشواری موفق می شود" چونکہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیر اثر پلی بڑھی اس لئے ردیف اردو شاعری کا اہم جزو بن کر رہ گئی ہے۔ "ردیف" شعر میں مسلسل تکرار کی وجہ سے شعر کی غنائیت میں اضافہ کرتی ہے اور قاری کو ایک خاص "لے" کیلئے آمادہ کرتی ہے لیکن صرف ردیف برائے ردیف استعمال کرنے سے شعر کی کیفیت میں چنداں اضافہ نہیں ہوتا۔ بڑا شاعر قافیہ کی چولوں کو ردیف کی چولوں کے ساتھ کچھ اس طرح بٹھا دیتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی ایک معلوم ہوتے ہیں اور جدا ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے بغیر ادھورے لگتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مُغنی صاحب کی ستر فیصد غزلیں مردف ہیں اس طرح سے تقریباً تیس فیصد غزلیں صرف قوافی پر ختم ہوتی ہیں۔ جن ردیفوں کو ہم ان کے کلام میں دیکھتے ہیں وہ عجیب ڈھنگ اور رنگ و سجی سے بنی ہیں جس کی وجہ سے حسین ردیف کے ساتھ حسین قافیہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مُغنی صاحب کے پاس کئی نئی قدر بہ طرز کی ردیفیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چونکہ غزل کی آزمائش فن کا آئینہ ہے اور تکرار غزل میں ایک اہم خصوصی، حسین ردیف بھی ہے اس لئے ہم اس گفتگو کے ذیل میں مشتی از خروارے ایک غزل کے چند اشعار جو خوبصورت ردیف میں مُغنی صاحب کے ہوئے قلم سے نکلے ہوئے ہیں پیش کرتے ہیں۔ جس کا فیصلہ آپ خود کریں گے کہ شاعر نے اس مشکل ردیف میں کیا کیا گل کھلائے اور کس زمین میں ایک ایسے لفظ کو جو جامد تھا قافیہ کی حرکت سے کیا متحرک کیا کہ پڑھنے والے کو بھی یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔

یوں تو ہر سمت سے اٹھتی ہیں بڑی آوازیں
نہ کوئی جست نہ جھنکار نری آوازیں
کوئی اٹھیں تو سرِ بزم قیامت کر دیں
یہ گلوگیر شکستوں میں کسی آوازیں
پھوٹ نکلیں گی کسی دن گل و گلشن کی طرح
ہیں بہت خاک کے تودوں میں دبی آوازیں
کبھی ملتے ہیں تہِ تیغ تڑپتے ہوئے بول
کبھی دیکھی ہیں صلیبوں پہ چڑھی آوازیں
کہیں دامن میں لگی آگ کہیں دل سلگے
ساز کے لب پہ تھیں وہ سوز بھری آوازیں
ہم نوا میرا نہ تھا کوئی بھی پہلے اور اب
میری آواز سے ملتی ہیں کئی آوازیں
تم پہنچتے ہو وہاں اپنی الاپیں مُغنی
نہ سنی جائیں جہاں کان پڑی آوازیں

اس طرح دوسری غزل میں جو عشقیہ شاعری کے معیار پر پوری اترتی ہے لیکن اپنا طور اساتذہ کی راہ پر گامزن ہے اور حقیقت سے لبریز ہوتی ہوئی بھی جو ماجائی کی زبان سے پاک ہے جو شاعری کی زبان برتنے کا کمال ہے۔ یہاں بھی قافیہ کو ردیف میں گھول دیا گیا ہے اور اگرچہ تحریر میں قافیہ اور ردیف کی حدوں کو متعین کیا جا سکتا ہے لیکن تقریر، تحلیل اور تحلیل میں یہ ممکن نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

مہکی ہے، معطر ہے فضا اس کے لبوں سے
حسنِ سخن اور نامِ خدا اس کے لبوں سے
ہر بات شگفتہ سی لگی اس کے لبوں سے
ہر آن شگوفہ سا کھلا اس کے لبوں سے
ہوگا کہیں سینے میں چھپا حرفِ وفا بھی
آتی تو ہے خوشبوئے وفا اس کے لبوں سے
کچھ اور بھڑک اٹھے گی لو شمعِ وفا کی
ہرگز نہ بجھے گا یہ دیا اس کے لبوں سے
گو عہد تو کرتا ہے مگر اس پہ بھی کیا ذکر
سن لے جو کوئی نام مرا اس کے لبوں سے
دشنام بھی پائے ہوئے خوش کام بھی مُغنی
ہم نے بہت انعام لیا اس کے لبوں سے

ایک اور مقام دیکھئے۔

ڈر جاؤ گے بشر کا جو چہرا دکھائی دے
اچھا اسی کو جانو جو اچھا دکھائی دے
وہ جلوہ گر ہے لاکھ کرشموں کے درمیاں

لیکن نظر کو ضد ہے کہ اونچا دکھائی دے
سو رفعتیں ترے سرِ عالی سے پست ہیں
تم ہو ذرا تو اور بھی اونچا دکھائی دے
شمّی یہ جانئے کہ بس اب آگئی بہار
جب چشمِ گل سے خون ابلتا دکھائی دے

ذیل کی غزل میں دو حرفے کے معمولی لفظ "ہاں" کو وہ وسعت معانی دی کہ ہر شعر میں اس کے معنی مختلف ہو گئے اور پھر قافیے سے مل کر نئے مطالب ابھرنے لگے اور لہجے میں چھپے ہوئے معنی ظاہر ہونے لگے۔

بات کیسی؟ بس اس قدر ہے کہ ہاں
بحر ماندہ سی اک نظر ہے کہ ہاں
اس طرف بھی نگاہِ خوش گزرے
عرض تم سے بس اس قدر ہے کہ ہاں
ان کا پیغام مفصل ہے کہ دیکھ
دل کا ایجاب مختصر ہے کہ ہاں
اہلِ دوزخ میں نامۂ اعمال
میرا اقرار مختصر ہے کہ ہاں
ساغرِ مے بھی چشمِ نم سے آج
دیکھتا مجھ کو گھور کر ہے کہ ہاں

میکالے کہتا ہے "انسانی جذبات کی گہرائیوں سے دو چشمے ابلتے ہیں ایک کا نام شاعری اور دوسرے کا نام موسیقی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے یعنی شاعری بغیر موسیقی کے بے جوہر ہوتی ہے اور موسیقی بغیر شاعری کے بے اثر ہوتی ہے" اس رو سے ہم جانتے ہیں کہ جس شعر میں نغمگی اور غنائیت بھری ہوتی ہے اس کا اثر دوآتشہ اور سحر انگیز ہوتا ہے۔ شمّی صاحب اس راز سے بخوبی واقف ہیں اور وہ صوت اور آہنگ کے ملاپ سے شہپارے اپنے مجموعہ کلام میں بکھیرتے ہیں۔

کس طرح حسن کی ہنسی لب پہ فغاں آتی ہے
مجھ سے پوچھو مجھے پھولوں کی زباں آتی ہے
زیرِ غم بیٹھئے تو الفاظ میں رس آتا ہے
دل کو خوں کیجئے تو افکار میں جاں آتی ہے
بات وہ ہے جو لبِ لعل نگاراں سے چلے
خوں بھی ہو دل تو یہ تاثیر کہاں آتی ہے
خوش نواؤں کے سخن ایک ہیں سارے شمّی
ان کو یورپ میں بھی دلّی کی زباں آتی ہے

دوسری غزل کے چند اشعار سنئے اور سر دھنئے۔

لالہ زار ہیں موسم میں مرے رنگِ غزل کے
آتی ہے تری یاد بڑے بھیس بدل کے
ہاں دور نہ زمانہ کوئی پیمانہ بدل کے
اب تک ترے پہلو میں وہی درد ہیں کل کے
پاتے نہیں اب ساز وہ نغمے جو ترنم رقص
گونجے تھے فضا میں ترے قدموں سے نکل کے
یاد آنے لگا پھر وہ مکاں تیری گلی کا
پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے
کچھ اب بھی غنیمت ہیں خیالوں کے اجالے
بڑھتے چلے جاتے ہیں نگاہوں کے دھندلکے
خائف نہ ہوں اربابِ خرد اہلِ جنوں سے
وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی غزلوں میں گیتوں کا رس بھرا ہوا ہے۔ یہیں شمّی صاحب کی غزلوں میں بھی گیتوں کا ترنم سنائی دیتا ہے۔ ہر لفظ ہر مصرعہ سانس کا ساز کا رچا ہوا ہو نظر آتا ہے۔ لفظوں میں پوشیدہ ذوقی ترنم ORGANIC RHYTHM جب آس پاس کے لفظوں کے زیر و بم سے ٹکراتا ہے تو شعر میں نغمگی بکھر جاتی ہے اور غزل ساز اور آواز کے سنگم میں دو آتشہ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔

بڑے دوستی میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے مارے ہیں یارو
شبِ ماہ میں ماہ پارے ہیں یارو
قیامت کے سامان سارے ہیں یارو
جو اترے چلے آرہے ہیں زمیں پر
یہ کس آسماں کے ستارے ہیں یارو
کہاں تک یہ اپنے پرائے کا قصہ
سبھی غم ہمارے تمہارے ہیں یارو
کہاں چھوٹ سکتے ہیں غم زندگی کے
یہ غم زندگی سے بھی پیارے ہیں یارو
میسر کسے دل کے تاروں کو چھونا
بہت خوش نظر اس میں ہارے ہیں یارو

دوسری غزل کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

محبت کے بندھن یہ کچے سے دھاگے
بڑا دم بڑا زور رکھتے تھے آگے

بہت ہم کو پیچھے زمانے نے چھوڑا
چلے تھے بہت ہم زمانے سے آگے
رواں ہیں سبھی ایک منزل کی جانب
بتا تیری دنیا سے کیا لے کے بھاگے

آج سے تقریباً پچاس (50) سال قبل مشفق خواجہ نے قومی زبان کراچی میں شمی کی غزل پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا ''شمی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہترین اظہار غزل ہی کے پیرائے میں ہوا ہے۔ وہ اس صنف کے فنی لوازمات سے پوری طرح واقف ہیں اور انھیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ ذریعہ اظہار خیالات کے بے ربطی کا آئینہ دار نہیں ہوتا بلکہ ایک مربوط اور مسلسل نظامِ فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل زندگی اور اس کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ شمی صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے زبان کے مسئلے میں احتیاط برتنے کے باوجود روایتی مضمون میں زبان دانی کا کہیں ثبوت نہیں دیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ایسی غزلیں جو انتہائی مشکل زمینوں میں لکھی گئی ہیں پڑھتے ہوئے کہیں بھی آورد اور تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔''

وہی اک فریبِ حسرت تھا کہ مشقِ نگاہ
سو قدم قدم پہ کھلا بطریقِ چشمِ کارواں
مرے آشیاں کا کیا ہے میرا آسماں سلامت
ہیں مرے چمن کی رونق یہی برقِ با دہ ماں
مرے ایک دل کی خاطر یہ کشاکشِ حوادث
ترے ایک غم کے بدلے یہ ہجومِ غم گساراں
وہ نگاہِ ناز پرور کہ عطائے طبرہاں ہے
یہ نصیب تر کٹورا نہ برائے خواستگاراں
مری وحشتوں نے جس کو سرِ شام کے راز رکھا
وہی راز جو کہ لب تک ہے بیانِ رازداراں
کسی منچلے نے رکھا ہے ئے تخیّل سے بھر کر
کہ یہ ساغرِ دل افزا ہے یہ بزمِ دل فگاراں

☆

سوتی کالی رات ہے سجی پر ساری سی
آؤ تم سے بات کریں اک پیاری سی
لوٹ رہا ہے جیسے گجرا مہکتا کوئی
دیکھو ہوا کیا پھرتی ہے مست ماری سی
دامن پر ہیں گرتے بکھرے نگھرے پھول
آئی کہاں سے رنگ کی پچکاری سی

تشبیہات، استعارات، مجازِ مرسل اور کنایات کو بھی بڑا دخل ہے۔ آج کل نوجوان شعرا قدیم استعارات اور تشبیہات کو لکیر کے فقیر بن کے برت رہے ہیں اور چونکہ قارئین کا مطالعہ محدود ہو چکا ہے وہ انھیں جدید کہہ کر سراہ رہے ہیں۔ تشبیہ شعر کی جان نہ سہی اس کی آن بان اور شان ضرور ہوتی ہے۔ معمولی شعرا تو تشبیہ سے خیال کو قابل کر رنگین اور بیان کو دلکش بناتے ہیں لیکن عظیم شعرا اپنے فکر و خیال اور احساس کی عظمت اور فضیلت کو روشن کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تا کہ ہر شخص اپنی فکری استطاعت اور ذہنی قدرت کے مطابق کسی منزل تک پہنچ سکے اور یہی تشبیہات کی گہرائی اور گیرائی شمی صاحب کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے

بزم آتی ہے صنم خانہ دیراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے پریوں کی طرح

☆

یوں ہیں آسودہ شانوں پر گیسو تیرے
جیسے آشفتہ جانوں کو نیند آ گئی

☆

ہم تو کہتے ہیں صبا قطرۂ شبنم اس کو
جو کسی نرگسِ بیمار کے کام آ جائے

☆

وہ سنبھلے سے لہجے میں کچھ کچھ ہنسی
کہ جیسے چھلکا ہو گگری سے جل

شمی کا تغزل روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید اور ایجادی ہے
بعض اکابر یہ کہتے ہیں کہ ان کے روایتی رجحان پر داغؔ اور حسرتؔ کی شاعری کا اثر ہے لیکن یہ اثر شاید اتنا کم تر ہے کہ یہ رنگ ہمیں نظر نہیں آتا۔ شمی کی شاعری میں سراپا نگاری، معاملہ نگاری، لذت و لطافت، رعایتِ لفظی اور دوسری خوبیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہاں لہجے میں متانت لفظوں میں شگفتگی زبان برتنے میں مہارت داغؔ کو بھی ہونے سے کہ دبستانِ دہلوی سے ورثے میں ملی تھی۔
شمی سادہ، نرم، شستہ اور شگفتہ الفاظ میں بڑی موثر اور دلکش بات کہہ دیتے ہیں۔ جامد اور بے حس لفظوں میں متحرک پیکر تراشتے ہیں۔ خیالات کی خوشبو دیر تک قاری کے دماغ میں مہکتی رہتی ہے۔ ان تمام کرشموں کے باوجود عجز و انکساری تو دیکھیے

بن گئی یوں ہی سخن میں ذرا نوک پلک
میرے لہجے میں کہاں ہے میر کے جینے کی کھنک

محاسن شعر میں صنائع بدائع کے علاوہ علم بیان کے امور یعنی ' اور پھر اپنے دل کو یہ کہہ کر منا لیتے ہیں۔

میسر کسے دل کے تاروں کو چھیڑا
بہت نغمہ گر اس میں ہارے ہیں یارو

شمّی کی غزل میں ان کی زبان و بیان پر قدرت اور احساسات کی
شدت، اور بے خیالات کی کثرت اور خوش آئند زندگی کی حسرت صاف دکھائی
دیتی ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھئے وہ غزل کو صرف ہی مرقع بنانے کے خواہاں
ہیں اگرچہ ان کا عقیدہ بھی ہے۔

اتنا ہی کافی ہے کہ تیرے بن نہ رہا جائے
وہ جاں پہ بنی ہے کہ جئے بن نہ رہا جائے
غم بڑھ گیا تجھے افسردہ کیا دل
اور پھر کوئی تدبیر کئے بن نہ رہا جائے
ہے دل ہی وہ نادان کہ ہو تدبیر سے نومید
اور پھر کوئی تدبیر کئے بن نہ رہا جائے
ہر چند کہ فرصت میں تری زہر ہے جینا
کچھ قہر ہے ایسا کہ جئے بن نہ رہا جائے

☆

اک مہک سی دم تحریر کہاں سے آئی
نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی
پہلے ہر سانس اک موج ہوا گزری تھی
یہ چھنکتی ہوئی زنجیر کہاں سے آئی
گو ترستا ہے ابھی تک تری تحریر کو دل
پھر بھی جانے تری تصویر کہاں سے آئی
یونہی ہو جاتا ہے قسمت سے کوئی غم پرور
عشق کے ہاتھ میں تقدیر کہاں سے آئی

شمّی صاحب کی غزلوں میں خارجیت کے مقابلے میں داخلیت کو
بڑا دخل ہے اگرچہ ان کی اولین غزلوں میں خارجیت کی طرف بھی میلان رہا
ہے۔ شمّی صاحب کی غزلیں حسرت کی غزلوں کی طرح سراپا طرب اور نشاط
یا فانی کی غزلوں کی طرح غم انگیز و یاس کا مرقع نہیں بلکہ ان دونوں حدوں کے
درمیان ایک وہ احساس ہے جو تلخی سے دور اور سچائی سے قریب ہے جس
میں ایک خوش آئند فردا کی جھلک نظر آتی ہے اور یہی کیفیت بے قراری میں قرار
فراہم کرتی ہے۔ ذیل کی غزل کا ہر شعر حلقۂ زنجیر طرب کی زبان بن کر اپنے
تخلیق کار کی تجربہ پائی اور زبان دانی کا اعتراف کر رہا ہے

ایسا ہے غزل کرتی ہے موسم کی ادائیں
اک موج ترنم کی ہوں میں ہیں فضائیں
آ ہم تجھے محراب تمنا میں سجائیں
اے شمع وفا ہم تیرے سر کی بلائیں
ہر گام پہ کتنی ہیں وہ دوست ادائیں
جب ہاتھ میں خنجر ہو تو کیوں ہوش میں آئیں
آئینے سے ہوتی ہیں ملاقیں کہ کسی کو
جب خوب ملا ہو تو کس طرح ملائیں
ٹھہرا ہوں اسی بات پہ میں لائق تعزیر
جس بات پہ بخشی گئیں اوروں کی خطائیں
اے مشکبو خوبان زماں شمّی عزیز اس
ہم بھی کبھی بکتے ترے بازار میں آئیں

ہم اپنی گفتگو کو مولانا نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی کے جملوں پر
تمام کریں گے تو شمّی صاحب کی شعر و ادب کی خدمت پر تحفۂ ستائش امتیاز سے
کچھ کم نہیں۔ مولانا نیاز فتح پوری نے شمّی صاحب کو اس عہد کے خوش فکر اور خوش
گو شاعروں میں سب سے زیادہ صحیح اور بے عیب شعر کہنے والا کہا ہے اور یہ
کہتے ہیں جو چیز مجھے پسند آئی وہ ان کی ادبی احتیاط اور ان کا فنی رکھ رکھاؤ ہے وہ
بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کہتے ہیں "شمّی صاحب اردو کی نوک پلک سے
اس قدر واقف ہیں کہ ان کی اس لیاقت کا کوئی دوسرا آدمی آسانی کے ساتھ نہیں
مل سکے گا"۔ لیکن ان تمام عظمتوں کی حامل شخصیت اپنی عجز و انکساری اور منکسر
المزاجی کی وجہ سے ہمیشہ شہرت سے کتراتی رہی جس کا خود اعتراف بھی کرتے
ہیں۔

شمّی مزاج دل نے نہ دی فرصت نگاہ
شہرت ہزار نام مرا پوچھتی رہی

جب تک اردو شاعری کے افق پر غزل کا پرچم لہراتا رہے گا شمّی کا
نام بھی بلندیوں پر پرواز کرتا رہے گا۔ اگر شمّی صاحب تیس (30) سال سے
زیادہ عرصہ لسانیات اور لغات کے جنگلوں کو صاف کرنے میں صرف نہ کرتے
اور اپنی پوری توجہ غزل پر صرف کر دیتے تو ان کی غزل کا معیار کیا ہوتا خدا ہی بہتر
جانتا ہے۔ اگرچہ اس طولانی ادبی بن باس نے انہیں دوسری نعمتوں سے لبریز اور
سرشار کر دیا جس کے لیے ہم شمّی صاحب کے تہہ دل سے مشکور اور ممنون ہیں۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

☆

نہ گئی۔

اور مشاعرے کینیڈا کے ہوں یا امریکہ کے، دتی کے ہوں یا دلی و لکھنؤ کے، عالی صاحب سوزشِ گلو کی ہو تو (خرچ کے اخراجات میں) کشاں کشاں چلے جاتے ہیں۔ (کارگاہِ وطن، صفحہ ۲۱۵) اور مشاعرہ پڑھ کر سرمہ در گلو کی ہو تو لوٹ آتے ہیں (ایضاً صفحہ ۲۰۲) یعنی آگے جتنی گے دم لے کر۔

اُن کے سیاحتی کالم کا ایک وصف یہ ہے کہ اُس سے کچھ معروضی سوچ اُبھرتی رہتی ہے۔ مثلاً اردو کو ہی لے لیجیے۔ عالی صاحب کا ایک پرانا کالم دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۸۵ء کا۔ وہ دلی کے افسانہ سیمینار کے حوالے سے اپنی یادداشتیں تازہ کر رہے تھے۔ اور بتا رہے تھے کہ بھارت میں "مقبوضہ کشمیر کو چھوڑ کر بہار کے سوا کسی ریاست کی ثانوی زبان بھی اردو نہیں مگر وہاں ہر جگہ مشاعروں، مذاکروں اور کتابوں کا زور ہے۔" پھر انھیں امریکہ یاد آ گیا جہاں کی جامعات میں اردو تحقیق و تدریس کے شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ انھوں نے کینیڈا کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ "ٹورنٹو تو لندن کے بعد پوری مغربی دنیا کا سب سے بڑا اردو مرکز بن چکا ہے۔"

عالی صاحب ایک بار روسے (ایضاً صفحہ ۵۰۹) بھی گئے تو کہیں پتا چلا کہ وہاں برف پر پھسلنا ضروری ہے حتیٰ کہ وہاں کا بادشاہ جو اُن دنوں (۱۹۸۷ء) چودہ برس کا ہو چکا تھا، برف پر پھسلنے کا بہت ماہر تھا مگر اب تو ہم شیخی کے انقلاب کے باعث کچھ ادھر ادھر سا رہنے لگا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ روسے میں سینما قومی ملکیت میں ہیں اور سینماؤں کی آمدنی سرکاری خزانے میں نہیں جاتی بلکہ ثقافت کے تحفظ پر خرچ ہوتی ہے۔ دیکھا آپ نے، وہ ہر سے بھی کوئی نہ کوئی اچھی بات نکال کر ہمیں بالواسطہ سوچنے پر اکساتے رہتے ہیں۔

عالی صاحب کا ایک وصف اور بھی ہے۔ وہ اپنے اوپر خود بھی ہنسنا جانتے ہیں۔ دلی کے مذکورہ صد افسانہ سیمینار میں جب ہندوستانی نقادوں نے بار بار منٹو، بیدی اور رشید امجد کے افسانوں کا ذکر کیا تو ہوتے ہوتے وہ کہہ اٹھے "اُن کی چند کتابیں جلدی جلدی دوبارہ پڑھیں تو محسوس ہوا کہ یہ واقعی اُن کا حق تھا۔" (کارگاہِ وطن، صفحہ ۱۰۲)

اب اُن کی کالم نویسی کا ایک اور پہلو دیکھیے۔ انھوں نے عرصہ ہوا راولپنڈی میں اوجڑی کیمپ کے حادثے اور خوب بدتر گری کراچی کے سانحے پر کالم لکھا تھا (کارگاہِ وطن، صفحہ ۲۱) اور ساتھ ہی بتایا تھا کہ ان سانحوں کے باوجود لوگ حسبِ سابق عید کارڈ بھیجتے رہے یعنی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تاہم انھوں نے لوگوں کے اس رویے پر بھی اعتبار ہوتی۔ پاکستانی قوم کو بے شرم نہیں، "بے غم" کہا اور ساتھ ہی ہیگل اور مارکس کے اس نظریے کو دہرا کر بتایا کہ کسی بھی قوم کی یا کسی بھی ملک کی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک بیماری ہوتی ہے۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ عالی صاحب بعض اوقات کا مزاح کا کالم بھی لکھ جاتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ "منتخبات" عالی صاحب کا بہت پسندیدہ موضوع ہے اور انھیں جب بھی موقع ملتا ہے اس پر ضرور لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں کارگاہِ وطن (صفحہ ۱۸۳) کا ایک کالم دیکھیے جس میں انھوں نے پاکستانی قومیت کے حوالے سے کچھ اشارے کیے ہیں۔ مثلاً صوبوں اور زبان کے معاملات میں "حق، اہلیت اور انصاف" سے کام لینا چاہیے تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ محض لسانی تشخص اور صوبائی حدود تقسیمِ معاش کے لیے بنائے انصاف نہیں ہے کہ پاکستان کی تشکیل میں مقامی ہی نہیں، پورے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کا حصہ ہے مگر اس نظریے کو پروان ابھی تک نہیں لی۔ مختصر کہ قومیت کی تعمیر ہو تو کیسے؟ حقیقی انتقال پر اقتدار کم پڑتی ہے۔ غور کیجیے، سہیل نے کیسی فکر انگیز باتیں کتنی سادگی اور روانی سے قلمبند ہوئی ہیں۔

عالی صاحب نے ایک مرتبہ (۳ اگست ۱۹۸۹ء) جب بے نظیر وزیر اعظم تھیں، اپنے کالم میں قومی یک جہتی کے حوالے سے انھیں بھی مشورہ دیا تھا کہ "اپنے پسندیدہ دانشوروں کو ہی جمع کیجیے اور انھیں صرف خطاب کرنے کی بجائے اُن کی بھی سنیے۔" (کارگاہِ وطن: صفحہ ۲۳) ظاہر ہے کہ یہ مشورہ کسی ایک عہد کے حکمرانوں کے لیے ہی نہیں ہے۔ عالی کے کالموں کو کہیں سے پڑھ جائیے ان میں اجتماعی سوچ اور اجتماعی فلاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ملے گا۔ سچ میں وہ تبصرہ بھی پڑھتے جائیے جو ان کالموں پر یار لوگ کرتے رہتے ہیں اور انھیں "جامِ جم" کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون لکھتے وقت (۸ نومبر ۲۰۰۸ء) عالی صاحب کا ایک ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۹ء کا تحریر شدہ کالم (کارگاہِ وطن: صفحہ ۱۰۲) نظر نواز ہوا۔ مضمون "عدل" کا ہے جس میں ایک یونانی سیاست کار تھراسی میکس اپنے کمزور مدِ مقابل کو سمجھا رہا ہے "میرا دعویٰ ہے کہ عدل طاقت ور کے مفاد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے" اس پر عالی صاحب اپنا حاشیہ چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "عہدِ جدید نے اس میں اقتدار کے ساتھ ساتھ دولت کو بھی شامل کر دیا ہے" اور پھر افلاطون کا یہ جملہ دہراتے ہیں کہ "عدل انسانوں کا اجتماعی بندوبست یا عہد نامہ ہے عدل کے نفاذ کے لیے۔ ایک عزم ہے انصاف کے لیے جو ایک سیاسی معاشرے کا قانونی اصول ہے" اور پھر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ "وہ فرسودہ بڑھاتے دولت کو وہیں دو بار اقتدار کو بلکہ کھا کا کیا یل قسم کی باتیں کرتا ہے" جب اس پر بھی تسلی نہیں ہوتی تو حسرت موہانی کا مصرع "جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں" ٹائپ کر کے کالم کا سانس لیتے ہیں۔

اب ان سطور کو جو آج سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھیں، جس عہد کے سیاق و سباق میں چاہیں پڑھ لیں۔ سچائی کی یہی خوبی ہے کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوتی۔

بہر حال آدمی پھر آدمی ہے اپنی اچھائیوں اور برائیوں سمیت۔ اور عالی صاحب بھی آدمی ہیں۔ انھیں ایک تو "تکبر کا کمپلیکس" نے مار رکھا ہے۔ متعدد کالموں میں اس لفظ کے استعمال سے معاصرت کا اظہار کرتے ہیں اور بے حد مکرتے ہیں مگر پاکستانیت کی ڈفلی بھی بجاتے ہیں۔ میں "کارگاہِ وطن" اور "بارگاہِ وطن" کے متعلقہ صفحات کے نمبر عمداً نہیں لکھ رہا ورنہ کہیں تلپٹ کہیں

اے شہرِ تمنا

بغداد

شبنم رومانی (کراچی)

اے شہرِ تمنا! میں ترے نام کے صدقے
دنیا کا ضمیر اب تری جانب نگراں ہے

رزمِ حق و باطل میں ہے فولاد کی مانند
اور کفر کی یلغار پہ اک ضربِ گراں ہے

دشمن کے لئے جنگ مسلماں کے لیے عزم
جو جنگ سے لڑ جائے وہ عزم جواں ہے

ہر عہد میں تاریخ بناتا ہے مسلمان
ہر توپ کی آواز مؤرخ کی زباں ہے

ہر سمت ہے کھیتوں میں شجاعت کی نئی فصل
ہر بازوئے ہمت میں نیا خون رواں ہے

ہر پھول ہے دشمن کے لیے آتشِ دوزخ
ہر خار عدو کے لیے اک نوکِ سناں ہے

مومن کے لیے موت بھی ہے زانوئے محبوب
کافر کے لیے زیست بھی اندیشۂ جاں ہے!

مومن کا جہاں وحدتِ افکار و عزائم
کافر کا جہاں کشمکشِ قوتِ اضداد

کافر کو بھروسا فقط اسبابِ جہاں پر
مومن کا سہارا فقط اللہ کی امداد

کافر کی سیاست میں ہے تخریب کا جوہر
مومن کی صداقت پہ ہے تہذیب کی بنیاد

کافر کا خدا ڈھال، مسلماں کی خودی تیغ
کافر کا ہے منہ زرد، مسلماں کا ہے دل شاد

اے شہرِ وفا! اہلِ جفا ہیں تری زد پر
اے صیدِ بلا! اب پہنچے ترے دام میں صیاد

اے ملک! وہ جوہر ترے بیٹوں نے دکھائے
سب چیخ اٹھے قوتِ ایماں ہے خداداد

اے کارگہِ اہلِ جنوں! ضرب اک ایسی
صدیوں تک اہلِ جہاں جس کو رکھے یاد

"ناگہاں" اور "بے نہایت"

ستیہ پال آنند (یو ایس اے)

"ناگہاں" اور "بے نہایت" سے اگر پوچھے کوئی تو تجھے معلوم ہوگا
"ناگہاں" تو میں ہوں، لیکن کون تھا وہ "بے نہایت"؟
کوئی پچھلا جس نے تجھ کو مجھ سے پہلے
تیری کچی عمر میں
یوں چیر کر زخمی کیا تھا ۔۔۔ تو تڑپتی رہ گئی تھی، اور یہ کڑوا کسیلا زہر
سوتے جاگتے خوابوں میں امرت جان کر پیتی رہی ہے
کیوں بھلا؟ کیوں "نور" "نغمے" یا کسی "حرفِ تسلی" سے
ترا "نادر خلا" خالی رہا اتنے دنوں تک؟
اور اب پھر تو آج اگر اک ناگہانی حادثے میں
"ناگہاں" سے آملی ہے اپنی پکی عمر میں تو یوں سمجھ
جیسے کہ کچی اور پکی، دونوں عمروں میں کوئی نسبت نہیں ہے
پوچھ خود سے
ایک چوتھائی صدی کے بعد پھر کیوں
جستجو ہے تجھ کو اس ظالم درندہ صفت کی، جس کو یہ کہہ کر
چھوڑ آئی تھی جھٹک کر، "ایک وحشی جانور ہو بے نہایت!
تم سے نفرت ہے مجھے!"
"ناگہاں" کیا "بے نہایت" کی طرح وحشی نہیں تھا؟
ہاں، مگر وہ جانور شاید نہیں تھا
(جانور، تم جانتی ہو، چیرتے ہیں، پھاڑتے ہیں!)
اس لیے اب تجربہ اپنی پکی عمر میں دہرا کے خود
"حرفِ تسلی" کا سہارا چاہتی ہو؟
خود سے پوچھو، کیا یہ سچائی نہیں ہے؟

خواب ٹوٹ گیا

شہریار
(علی گڑھ، بھارت)

میں کہیں کھو گیا ہوں
رہ رہ کر
نیند میں جاگتے میں
مجھ کو یہ خوف کیوں ستاتا ہے
اس تصور سے ہول آتا ہے

رات پھر ایک شخص نے مجھ کو
بھیڑ کی نذر کر دیا اور میں
دیر تک دور تک بھٹکتا رہا
یہ تو کہیے کہ خواب ٹوٹ گیا

○

غالبؔ سے فیضؔ و فرازؔ تک

یونس صابر (پشاور)

ا — احمد شاہ فرازؔ غزل کا مہکتا نام
ح — حرفِ ہنر کی سوہنی موہنی سی دیوی
م — منِ مندر میں اُس کی مالا جپتی ہے
د — درد کا دارو پی کے پیاسے غم سہتا
ف — فارغؔ، خاطرؔ، محسنؔ کا ہمعصر کرودہ
ر — روپ روپ چہروں کا تھا جانِ جاناں
ا — اُردو دُنیا نے LEGEND اُسے مانا
ز — زرّیں عہد تھا اُس کا جو اب ختم ہوا!!

○

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

غالب عرفانؔ (کراچی)

خوابِ مسلم کی نئی تعبیر کے سائنس داں
قوتِ اسلام کی توقیر کے روشن ضمیر
تا ابد جو زندہ رہتے ہیں انہیں کے رہنما
پاک ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر

○

پیارے احمد فرازؔ............نقاش کاظمی (کراچی)

مرے فرازؔ
مرے محترم۔مرے بھائی

اُداس کر گئے تم
میکدوں کی شاموں کو
ہمیں پلائے گا اب کون
وہ شرابِ سخن
کہ جس میں عدل کی میزان ہو
قلم کی طرح کہ جس کے نشے میں
انصاف کی آواز ہو
مرے فرازؔ۔مرے محترم۔مرے بھائی۔
ہر کتاب کسی تازہ گلبدن
کی طرح
مجھے یقین ہے
کہ خوابوں میں آ ملو گے کبھی
کہ اب تو خوابوں کی
تعبیر کا زمانہ ہے
کہ اب حصارِ ستم ہے
تمام دروازے
کہ آج سطوتِ شمشیر کے
تمام گنبد
شکوہِ عزمِ قلم سے ہیں
لرزہ براندام۔
مرے فرازؔ۔مرے محترم۔مرے بھائی
کوئی کہے نہ کہے
اک زمانہ کہتا ہے
کہ تم نے جو بھی لکھا
وہ تپاکِ جاں سے لکھا
کہ جس میں لوحِ کماں کی
زبان تیر کی تھی۔
مرے فرازؔ
مرے محترم
مرے بھائی

یادوں کے سائے

سرور انبالوی (راولپنڈی)

آوارہ بگولے اُٹھے ہیں فریاد کی سانسیں رکتی ہیں
یہ میٹھی میٹھی ویرانی اور یاد تمہاری یوں آئی
پلکوں پہ سجائے بیٹھا ہوں مدھم سے دیئے کچھ اشکوں کے
دل جس کے سہارے زندہ ہے وہ صرف تمہاری یادیں ہیں
تم آئے خانۂ ویراں میں یا اترا ہے مہتاب کوئی
تم میرے دل کی آشا ہو، تم میرے دل کی آبادی
جو آگ دبی تھی سینہ میں اب اُس کو جلانے آئے ہو
صدیوں کے سلگتے صحرا میں برفاب کی دیوی اتری ہے
اتری ہے فلک سے "حور" کوئی اوڑھے ہوئے نور کا دوشالا
اس خندہ رخندہ مکھڑے پہ مہتاب کی قاشیں رکھی ہیں
آنکھوں میں محبت بارہ ہے پلکوں پہ ہزاروں افسانے
پہرا ہے سر پر ہالہ کئے رعنائی جلو میں چلتی ہے
معصوم ادا کے جلووں سے ضوپا کے ستارے بکھرے ہیں
آکاش سے پریاں آ آ کر یوں مانگ میں موتی جڑتی ہیں
بیداری خواب کے لاشہ کو پہلو میں لئے ترستی ہے
یوں "تیری" چاہت کے سپنے آنکھوں میں بسیرا کرتے ہیں
قلاش زمانہ سے مانگے جو بھیک وہ پگلا کہلائے
کیا تم نے کبھی برساتوں میں نمناک نگاہیں دیکھی ہیں
ہستی کی فضائیں ٹوٹی ہیں، فطرت کی طبیعت ٹھیک نہیں

کونین کی نبضیں ساکت ہیں فطرت کی رگیں کچھ دکھتی ہیں
آکاش کے منڈل میں جیسے باجے ہے درد کی شہنائی
آ جاؤ کہ تم ہی باسی ہو اِن اُجڑے اُجڑے محلوں کے
کچھ غم کے سلگتے نالے ہیں دم توڑتی کچھ فریادیں ہیں
یہ خندہ مخندہ دھوکہ ہے یا بیداری کا خواب کوئی
یا جیسے ویراں محلوں میں ہے قید کوئی شہزادی
یا مجھ کو میرے سپنوں کی تعبیر بتانے آئے ہو
پارے کے سمندر میں گویا مہتاب کی دیوی اتری ہے
ماتھے پہ چاند کا ٹکڑا ہے تاروں کی گلے میں ہے مالا
جذبات سے عاری ہونٹوں پہ فریاد کی لاشیں رکھی ہیں
تم پاس کی بستی کے دیپک، تم اجنبی جانے پہچانے!
زلفوں میں ہے چشمۂ آب بقا آنچل میں قیامت پلتی ہے
یا جانِ حیا کے دامن پہ تقدیس کے موتی بکھرے ہیں
جس طرح شکستہ آئینہ پہ خورشید کی کرنیں پڑتی ہیں
نیند اپنے پاؤں کے تلووں سے بیٹھی ہوئی کانٹے چنتی ہے
جس طرح سے بیوہ کے ارماں مرقد سے لپٹ کر روتے ہیں
سنگ آ گئیں اونچے محلوں سے اور سر کو پکڑ کر رہ جائے
دم توڑتے ارماں دیکھے ہیں، ہنستی ہوئی آنکھیں دیکھی ہیں
اِن اونچے اونچے ایوانوں میں ہمدردی کی بھیک نہیں

○

ڈاکٹر یوگیندر بکل تشنہ

کینیڈا کی زندگی

گھر سے باہر' دور تک کچھ بھی نہ تھا
کوئی ہمدم' کوئی محرم ہمنوا
کہنے' سننے' دیکھنے کو بھی خوب تر
خود سے جدا' ہر شخص ٹھہرا
کر سکے اپنی بیاں نہ داستاں
جھانکنے کو دل میں میرے کون تھا!
شکوہ کیسا! دل کے کہنے میں آ گئے
شانِ مغرب' تھا رہا اچھا تھا
برف باری کے دلوں میں آدمی
اور بھی یاں تھا و جاہ دکھا
ہاں مگر' زندگی نہیں یاں زندگی
آدمی ہر صورت یہاں چلتا رہا
رشتۂ جسم و جاں قائم رہے
کام کرنا مجبوری و لازم رہا
خطۂ ہند و پاک سے پرے دوست'
دوستی کو ہر شخص ہے ترسا کیا

○

(امریکہ سے رخصت کے وقت بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر)

تیری آنکھوں سے چھلکتے ہیں یہ آنسو کیسے!
تم اگر چاہتے' حالات نہ ہوتے ایسا!
شائد تم بھول گئے' یا کہ یوں سوچا نہ تھا'
ورنہ ممکن تھا کہاں' لوٹنا میرا ایسے
درد کی گرد لپیٹے ہوں میں بھٹکتا در در
تمکو اندازا نہ تھا؟ بھٹکے گا تنہا ایسے
کٹتا ہے میرا سفر اس طرح ٹوٹا گرا
مجھکو احباب نے بے ٹوٹ کے چاہا ایسے
بھول چکا ہوں' جو بھی شکوے گلے تھے تجھکو
قسمت میں کاتبِ تقدیر نے لکھا ایسے
زندگی اب تجھے مڑ کے بھی دیکھوں کیونکر
لوٹ کر آتا نہیں لیدوست گذشتہ ایسے
خوش رہو' زندگی اپنی جیو' میرا کیا!
زندگانی کا نشہ ٹوٹا تھا تشنہ ایسے
تیری آنکھوں سے چھلکتے ہیں یہ آنسو کیسے
تم اگر چاہتے' حالات نہ ہوتے ایسے

دعا

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

یہ کیسی فضائیں ہیں
جس کے گل ولالہ سے اپنی ہی مہک آئے،
ہر سانس کی سوں سوں میں اپنی ہی صدا گونجے
رنگوں کے بھی منظر اپنے ہی نظر آئیں،
پھولوں کے جسم میں اپنی ہی جھلک پائیں
اظہارِ محبت کے اطوار نرالے ہیں
وہ مجھ میں نظر آئے، میں اُس میں نظر آؤں

جب پیڑ ہواؤں سے سرگوشیاں کرتے ہیں
اور شاخ سے گدرائے پھل ٹوٹ کے گرتے ہیں
زمتا اور نکھرتی ہے دل اور مچلتے ہیں

جب صبح کے آنگن میں چنچل پرندوں کی
تہذیبِ سماعت سے روحوں میں اترتی ہے
نکھر اوس بن کر کتنی ہی جبینوں کو
توفیقِ اطاعت سے ضو ریز بناتی ہے
کرتی ہے گلی کوچے معمور درودوں سے
محسوس یہ ہوتا ہے پھر کوئی دعا پہنچی
اور عرش کے پائے کو بھیگی ہوئی پلکوں سے
یوں چوم کے کہتی ہے:
اقرار ازل کا ہے تسلیم ابد تک ہے
تو خالق و مالک ہے سب ارض و سما تیرے
سب رنگوں سے افضل ہیں وہ رنگ جو تیرے ہیں
یہ میرے گل ولالہ خوش رنگ ترے دم سے
اِن رنگوں کو قائم رکھ اِن رنگوں کو دائم رکھ
یہ رنگ سلامت ہیں تو میں بھی سلامت ہوں

فرار تعاقب واپسی!

میں بھاگ آیا ہوں پیچھے چھوڑ کر
ایک شورِ محشر!
یہ ایک خاموش منظر، یہ بہتا سا سمندر!
میرے پیچھے اب بھی
ایک صدائے بے صدا اُن قرض خواہوں کی
یہاں کوئی نہیں ہے
مگر مجھ کو یقیں ہے
کہ میرے ساحلِ دریا پہ آنے سے
صدائیں کم نہیں ہوں گی!
مگر پھر بھی میں بھاگ آیا ہوں
اپنے اُس مکاں سے
کرایہ جس کا پچھلے چھ مہینوں سے
پسینہ بہا تا رہا ہے جبینوں سے
میری بیوی کی اُس روشن جبیں سے،
ستارے جھڑ رہے تھے زلفِ عرق بہ یں سے
پسینہ دودھ بن کر قطرہ ـــــ قطرہ ـــــ
وہ آیا دودھ والا! ایک خطرہ ـــــ
وہ اِن خطرات کو نالے گی کب تک؟
اُس ایک معصوم بچے کو،
پلا کر خونِ دل پالے گی کب تک؟
نا جانے کیوں مجھے لگتا ہے پایا،
کہ جیسے پھر کرے تعاقب میرا،
یہاں بھی آن پہنچا ہے،
کرایہ مانگنے والا کوئی بنیا
نظر دوڑا کے پیچھے،
جو دیکھا میں نے نیچے
ریت پر میرے ہی قدموں کے نشاں تھے
بے گماں تھا
جو مجھ سے کہہ رہے تھے
"چلو واپس چلو حامد،
وہی بنیا، کرایہ مانگنے والا
وہی منظر، وہی دفتر،
وہی محشر،
ایک عالم اژدہا بن کر،
تمہارے منتظر ہیں!

حامد لطیف
(ممبئی بھارت)

درد کو دباؤ

پرویز مظفر (برطانیہ)

چیخ نکلی
تو پکڑے جاؤ گے
آہ نکلی تو لوگ
شک کی نگاہ سے دیکھیں گے
ہمدردی بھری آنکھوں سے
نہ دیکھنا
دنیا کبھی کی گزر چکی ہے
اُسے جینے کا ہنر نہیں آتا
اب زخم کیسے دکھائیں
دل کی بات کس کو بتائیں
اس لیے بس
درد کو چھپائے
تکلیف پر پھول سجائے
چاہے دنیا
کتنا ہی بلائے
مت جانا اُدھر کو
بس درد کو دبائے
جیے جانا۔

○

دوہے

کاوش پرتاپ گڑھی (دہلی بھارت)

چیونٹی نے گجراج کو کیسے دیا پچھاڑ
اک ذرے کے سامنے چت ہو گیا پہاڑ

چمکار ہی کو جگت کرتا ہے پرنام
ہم کو تم کو کس لیے کوئی کرے سلام

آنکھوں میں طاقت کہاں دیکھیں اس کا روپ
اس کے کاک ک روم سے پھوٹی ایسی دھوپ

ہاتھی گینڈے شیر کو لگا بہت آگھات
چیونٹی کے گھر آگئے بھولے شنکر رات

چندن بن کو کھا گئی دھو دھو کرتی آگ
ہرنی بھابھی کا ہوا جل کر راکھ سہاگ

اکثر وہ ملتا رہا دن میں بار مبار
آخر دیہاتی رہا میرا شہری یار

گھر آئے مہمان کو کہتے ہیں بھگوان
اپنے اپنے بھاگ کا کریں سبھی جلپان

خوش فہمی تھی کس قدر اس سے ہیں انجیس
ہم نکلے انہیں ہی وقت چار سو بیس

مولا تک نے قدر کی ہم ہیں وہ انسان
اس کے گھر جب تک رہے بنے رہے خاص مہمان

کاوش لکھ دن رات کو لکھ تو دن کو رات
وشے ہے کچھ بحث کا کہہ کچھ ایسی بات

اگر تم بیچنا چاہو

کرامت بخاری

(لاہور)

اگر بیچنا چاہو
ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
یہ دنیا ہے یہاں آواز بکتی ہے
یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں ہر حرف کی حرمت یہاں تحریر بکتی ہے
یہ بازار جہاں اک بیکراں گہرا سمندر ہے
یہاں پہ کشتیاں ساحل پہ آ کر ڈوب جاتی ہیں
مسافر مر بھی جاتے ہیں مگر روحیں نہیں جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اس جنگل میں مقتل کا سماں ہر وقت رہتا ہے
اگر تم بیچنا چاہو ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار رہتا ہے
جہاں پہ شام ہوتے ہی ہجوم یاس ہوتا ہے
غموں کی بھیڑ لگتی ہے
کئی یوسف سرِ بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو۔

○

ہائیکو

سیما پیروز (لاہور)

دیپک جلتا ہوتی ہے
جو آنکھ سے ٹپکا تھا
آنسو ہے کہ موتی ہے

چاندی کا کٹورا ہے
کیوں مان کرے اتنا
بس رنگ ہی گورا ہے

جگنو کہ شرارے ہیں
جو تم نے چرائے تھے
وہ خواب ہمارے ہیں

من چاہے گگن چھولوں
اب تم ہی کہو سجناں
میں کیسے تمہیں بھولوں

ٹہنی سے بکھری کلیاں
کیوں چھوڑ چلے ساجن
تم پیار کی یہ گلیاں

ہر بات نرالی ہے
چاہت بھری دنیا میں
میری جھولی خالی ہے

آکاش پہ تارے ہیں
اک عمر لڑے لیکن
ہم زیست سے ہارے ہیں

راوی کا کنارا ہے
دل پیار کی دنیا میں
جیتا بھی ہارا ہے

○

اجنبی ہوائیں

(امریکا میں قیام کے دوران کہی گئی ایک نظم)

مہندر پرتاپ چاند (تلہ راشٹر بھارت)

دیارِ غیر ہے اور اجنبی ہوائیں ہیں
فضا میں گہری اداسی کا دل گداز دھواں
یہ کس مقام پہ لائی مری حیات مجھے
جہاں ہیں یوں تو ہزاروں نشاط کے ساماں
بپا ہیں پھر بھی مرے دل میں کرب کے طوفاں!

یہ روشنی کا سمندر، یہ ریل پیل، یہ شور
بہت ہی تیز ہے رفتار ہر بشر کی یہاں
رواں دواں ہیں یہاں لوگ جو اِدھر سے اُدھر
خبر نہیں یہ ہیں، کس کی تلاش میں گرداں
خدا ہی جانتا ہے اِن کی منزلیں ہیں کہاں!

یہاں کے لوگ یقیناً بہت مُؤدب ہیں
اک ایک شخص یہاں ہے بہت سلیقہ شعار
بہت ہی خوب ہے اِن کی ادائے عجز و نیاز
بہت ہی نیک ہیں لوگوں کے اس جگہ اطوار
بہت کمال یہاں ہر بشر کی ہے گفتار!

بجا یہ اِن کا سلیقہ، بجا یہ اِن کا شعار
مگر دلوں میں کہیں بھی یہاں وہ بات نہیں
نہ وہ خلوص، نہ وہ دوستی، نہ اپنا پن
یہ دن وہ دن نہیں، یہ رات بھی وہ رات نہیں
مرے وطن کی طرح کی یہ کائنات نہیں

پرائے دیس کی اِن اجنبی ہواؤں میں
عجب طرح کی مجھے ہو رہی ہے آج گھٹن
دیارِ غیر میں اے چاند! جی نہیں لگتا
کوئی بھی رنگ ہو، اپنا وطن ہے اپنا وطن
کوئی بھی ڈھنگ ہو، اپنا وطن ہے اپنا وطن

○

شہنشاہ

فیصل عظیم
(کناڈا)

ورق پلٹو اگر تاریخ کے تو
وہی اک داستاں صدیوں پرانی
نئے چہروں، نئے ناموں میں ڈھل کر
نئے جسموں، نئے کپڑوں میں لپٹی
نئی وحشت لہو کے رنگ اور بارود کی بو
رقم کرتی ہوئی دیکھو گے شاید
عبارت میں نئی تاریخ ہوگی،
جگہ بدلے گی اور کردار بھی بدلے ہوئے ہوں گے
مگر غارت گری کا نام بدلو
تو بھی غارت گری، غارت گری ہے
کسی مغرور وحشی حکمراں سے وہ جڑی ہے
کسی طاقت کے زعمی کے نشے میں چور آنکھوں سے
چھلکتی خواہشوں کے رقص میں پھر سے پڑی ہے
ہوس کے تنگ ہوتے دائروں میں پھر کھڑی ہے
مگر تاریخ لکھی جا رہی ہے
نئی ہے روشنائی اور قلم بھی
نئے کردار بھی، نقشِ قدم بھی
اور اُن کی زد پہ تم بھی اور ہم بھی
وہی ہے داستاں لیکن یہاں بھی
جو کل تاریخ کا حصہ بھی ہوگی
اسی تاریخ کا سایہ بھی ہوگی

○

رباعیات

تحسین نوری
(کراچی)

تصویر مری، دل میں بنائے رکھنا
اس راز کو سینے میں چھپائے رکھنا
تعبیر کی امید لئے آنکھوں میں
خوابوں کے دریچوں کو سجائے رکھنا

کیا دل پہ گزرتی ہے سناؤں کیسے
دنیا کو تری بات بتاؤں کیسے
ہر سمت اندھیروں کی ہے یورش گھر میں
میں دیپ سرِ شام جلاؤں کیسے

اب قیس کی پاکیزہ روایت ہے کہاں
فرہادِ جفاکش کی حکایت ہے کہاں
نیرنگیِ عالم ہے بس حرص و ہوس
اس دور میں معیارِ محبت ہے کہاں

رکھتے نہیں جو دل میں ارادت بیٹے
وہ ماں کی نہیں کرتے اطاعت بیٹے
کیا حشر ہو، اُنکا یہ خدا ہی جانے
جو ماں کی نہیں کرتے ہیں عزت بیٹے

○

کس کا چہرہ؟

بہرام طارق
(اسلام آباد)

کس کا چہرہ نور کی قندیل تھا؟
اک طرف زندہ اجالوں کی کوئی تصویر تھی
چاندنی آنکھیں بھی جس کو دیکھ کر نم ہو گئیں
جیسے خوابوں کی کئی بوندیں زمیں پر گر پڑیں
فکر کے ویران جنگل چاندنی میں سو گئے
سو گئی پھر قرب کی انمول ساعت
چاندنی کی گود میں

دور لیکن پھر کسی زنجیر کی جھنکار تھی
درد کے صحرا کی اُڑتی ریت تھی
دور وادی میں بچھا تھا
کاغذی چہروں کا شہر
اور اکیلے پن کا زہر
سوچ کی اندھی بھکارن رات بھر روتی رہی
کس کا چہرہ نور کی قندیل تھا؟

○

"دسمبر!"

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کہیں کیا تم کو ____
تم تو اجنبی بن کے ____
ہوئے جاتے ہو اب رخصت ____
کبھی بھی پوچھو تو کیا ہوگا ____
کہ وہ وقتِ وداع ہوگا ____
کبھی بھی ان کہی ہوگی ____ سنی بھی ان سنی ہوگی ____
تنہا بیتے لمحوں کے دھاگے میں پروئی یادوں کی جھلمل ____
عجب تنہا کسی مسکان ہو جیسے ____
کہیں پیچھے کی جانب لے چلے گی ____
مگر کوئی سرا پائیں تو کیسے ____
تو پھر اگلے برس آؤ تو ڈھونڈیں ____
کوئی تو سلسلہ ہم پھر سے کھوجیں ____!

○

تخلیقِ عصر

بازتعارف کا تعارف
عطیہ سکندر علی (سکھر)

مسافت رائیگاں تھی

محترمہ شبنم شکیل اردو شاعری کا معتبر حوالہ اور ملاقت ورشائستگی کی حامل ایسی شاعرہ ہیں جنہوں ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے اردو شاعری کی آبرو اور نگہبانی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ شبنم شکیل کا شعری شعور شیر خواری سے شروع ہو کر ایک ایسے پختہ مقام کو آن پہنچا ہے جہاں ان کی زبان اور قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ خوبصورت شعری پیراہن اختیار کر لیتا ہے۔ حال ہی میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شبنم شکیل صاحبہ کی غزلوں کا مجموعہ "مسافت رائیگاں تھی" اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے جو ایک سو بارہ صفحات، اٹھاون غزلیں اور خالدہ حسین کے اکیس صفحات پر مشتمل پیش لفظ سے مزین ہے جس میں خالدہ حسین فرماتی ہیں۔ "مسافت رائیگاں تھی" شبنم کے ذہنی ارتقا میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں گذشتہ دو مجموعوں کے خیالات اور تجربات کو دہرایا نہیں گیا۔ شبنم جو ایک پاکستانی عورت کی زندگی اور اس کے مسائل لے کر اپنے شعری سفر پر روانہ ہوئی تھی کا زیرِ نظر مجموعہ میں شخصیت سے آزاد نظر آ رہی ہے۔ اس کے ہاں ایک پختہ شعری شعور مرکزی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے منفرد اور دھیمے لہجے میں آج کی دنیا میں کھیلے جانے والے انسانی تماشے کو بڑی دردمندی اور تجربے سے بیان کر رہی ہے۔

ہم تو گواہ ہیں کہ غلط تھا لکھا گیا
کیا فیصلہ ہوا تھا مگر کیا لکھا گیا

یہ کیسی منصفی تھی کہ منصف کے روبرو
جھوٹی شہادتوں کو بھی سچا لکھا گیا

مکتوبِ غم ہمارا پڑھا ہی نہیں گیا
ورنہ تو اس میں حال تھا سارا لکھا گیا

ملزم کو بھی تو ملتا ہے کچھ بولنے کا حق
پھر کیوں نہیں بیان ہمارا لکھا گیا

ہم چپ رہے کہ فیصلہ سارا تھا طے شدہ
یعنی جو مدعی نے لکھایا، لکھا گیا

یہاں اگر ہم اپنے عصر کی نہایت معتبر شاعرہ پروین شاکر مرحومہ کی شبنم صاحبہ کے بارے میں رائے کوٹ نہیں کریں گے تو ناانصافی کے مرتکب ہوں گے۔ "شبنم کی شاعری کا سفر ایک خوشگوار سفر ہے اس راستے میں جتنے شہر آتے ہیں ان کی آب و ہوا مختلف ہے اس دنیا سے بھی جو ہم نے شبنم کی آنکھوں سے پہلے پہل دیکھی اور اس دنیا سے بھی جو ہمیں اس عہد کے دوسرے حرف سازوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ اب سورج کی کرن شبنم سے گلے مل رہی ہے اور شبنم کے قاری جانتے ہیں کہ اس کی شاعری میں روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ شبنم کے اندر کی روشنی ہے۔ یہ شاعری کی وہ منزل ہے جب تخلیق کار کے ہاتھ میں اُن کی کا نظر آ جاتا ہے۔"

سنگ میل لاہور کی دیگر کتب کی مانند شبنم شکیل کی تازہ کتاب "مسافت رائیگاں تھی" بھی دیدہ زیب اور دلکش پیراہن سے ملبوس ہے اور قیمت محض ایک سو پچھتر روپے مقرر کی گئی ہے۔

دامنِ گل

وقت کی تیز رفتاری نے صاحب دل اور صاحب ذوق حضرات کو جس قدر روزگار پہنچائی ہے شاید ہی اور طرح کے لوگوں کو اس کا سامنا ہوا ہو۔ جو لوگ جسم و جاں کی بے قراری کے ساتھ دل، دماغ اور روح کی آبیاری کے آرزومند ہونے کے ساتھ وقت کے منہ زور گھوڑے سے نبرد آزمائی بھی اُن کی مجبوری ہوا کرتی ہے باوجود کوشش اور خواہش کے علمی اور ادبی ذوق کو اسی طور پر پا نہیں کر سکتے جس طور اُن کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ ایسے علم دوست خواتین و حضرات کے لئے ہمارے عصر کے نہایت اہم اور منفرد اسلوب کے حامل شاعر جناب خاقان خاور کاظمی نے سہولت کا اہتمام اس طرح کر دیا ہے کہ وہ کم از کم خاقان کاظمی صاحب کی نسبت کم وقت اور کم محنت سے زیادہ لطف اور زیادہ بالیدگی حاصل کر سکتے ہیں۔ خاقان کاظمی صاحب نے اپنے تین مطبوعہ شعری مجموعوں کی منتخب غزلیں دامن گل کے عنوان سے ترتیب دے کر زیورِ طبع سے آراستہ کر دی ہیں۔ خاقان کاظمی صاحب نے کفایت اور نفاست سے کام لیتے ہوئے صرف اکیاون منتخب غزلوں کو اس مجموعے میں شامل کیا ہے جن میں سے چند ایک کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔

لُٹا ہے آج یہ جو اِس آن بان سے
ہے کا کل لہو بھی ترے آسمان سے

جو سانحے ہیں دل کے انہیں آشکار کر دو
کبھی شرمسار ہو تو کبھی شرمسار کر دو

لذتِ جاں سے کبھی آہ وفغاں سے گزرا
آدمی وہ ہے کہ جو برقِ تپاں سے گزرا

ملا کر لطفِ خواب لئے گھر نہیں گیا
لیکن ترے خیال سے باہر نہیں گیا

اپنی بخشش وہ بصد ناز و ادا چاہتا ہے
اور سرکار سے بس میری سزا چاہتا ہے

اٹھا ہے جب تم آگ بجھانے کے لئے
ہمارے خوں سے گھروں کو سجانے کے لئے

یہ کیسا اُس نے عذاب آشنا اُتارا دن
گزر گیا شبِ ہجر کی طرح سارا دن

میر، غالب اور فیض کے کلام مضمون پر مختصر مگر منظوم کتاب ایک سو بارہ مجلد صفحات پر مشتمل ہے اور فقط ایک سو پچاس روپے کے عوض ویلکم بک اردو بازار کراچی پر دستیاب ہے۔

ایک تھی ملکہ

"نیلم احمد بشیر اپنے کام میں خوب تجربہ ہی ہیں۔ رواں لکھتی ہیں اور خوب لکھتی ہیں۔ زبان و بیان ان سے دوستانہ سلوک کرتا ہے۔ یہ امر وہ بخوبی جانتی ہیں کہ کہانی کو بہر حال کہانی ہونا چاہیے۔ سکے کہانی میں جو بھی دو پیچ ہوں مگر ریڑھ کی ہڈی تو کہانی ہے اور نیلم کی کہانیوں میں ریڑھ کی ہڈی بہت مضبوط ہے"۔۔۔۔ انتظار حسین

ہم جس ماحول اور معاشرے میں رہتے ہیں وہاں صنفِ نازک کا اپنی حیثیت اور مقام پانا اور منوانا جس قدر دشوار ہے اس سے ہم اور آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ چہ جائیکہ عورت ہو اور کہانی کار بھی تو جان لیجیے اس کا مستقل آشیانہ آستانہ تکلیفوں کا متقاضی ہو سکتا ہے ایسی تکلیفوں کا تقاضا جن کے لگانے کا علاج حکیم لقمان کے پاس ہو تو ہو کم از کم آج کے کسی حبیب و طبیب کے پاس تو دستیاب ہرگز نہیں۔ اس تمہید کے بیان کا مطلب اور مقصد فقط یہ ہے کہ ہم جب بھی صنفِ نازک کی کوئی تخلیق دیکھیں اور پڑھیں تو اسے صرف تخلیق کے طور پر ہی جانچیں اور پرکھیں۔ یہ امر ہمارے پیشِ نظر ضرور ہونا چاہیے کیا ہم ذہنی طور پر اس قدر بالغ ہو چکے ہیں کہ اپنی بہتر نصف کو اس قدر آزادی دے سکیں جس قدر ایک تخلیق کار کا حق بنتا ہے۔ شاید کہیں بطور انسان بھی اسے اس کا صحیح، درست اور واجب حق دینے میں بھی ہمیں دو پیش ہے اور یہ فقدان ہی بحر جانتا ہے کہ ہم اس رویے اور سوچ کی قید سے کب رہائی حاصل کریں گے کر بھی سکیں گے کہ نہیں۔

"ایک تھی ملکہ" نیلم احمد بشیر کی چند شاندار کہانیوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں مصنف نے اپنی بساط سے بڑھ کر ہم سے اپنا حق چھیننے کی کوشش کی ہے ہم میں اگر ہمت ہے حوصلہ ہے برداشت ہے تو ہمیں ان کہانیوں کے مطالعے کے بعد یہ ضرور سوچنا اور غور کرنا چاہیے کہ ایک تن تنہا کمزور ہونا تو ممکن عورت مگر اس قدر گھٹن اور حبس کے عالم میں نعرۂ حق بلند کر سکتی ہے تو آزاد ہوا اور فضا میں اس کے قلم کی اُڑان اور اُٹھان کیا ہو گی۔ "ایک تھی ملکہ" دو سو چالیس صفحات مجلد اور چوبیس رنگا رنگ کہانیوں کی امین ہے جس کی قیمت تین سو پچاس روپے اور دستیابی ملک بک سیل لاہور سے ممکن ہے۔

ترانہ

"ترانہ" علمی اور فکری اعتبار سے باقاعدہ صنف کی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس طرح رباعی کی تخلیق بہ اعتبار ارکان و آہنگ وقت طلب ہے اسی طرح ترانہ بھی رباعی کے اوزان سے مکمل آگہی کے بغیر خلق کیا جانا ممکن نہیں ہے اس کے باوجود بعض رواں دواں اوزانِ رباعی میں نادر الکلام شعرا ہی آسانی اس کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ کوثر صدیقی صاحب نے بڑے عزم سے اسے صنفِ سخن کیا ہے

تسلیم کریں یا نہ کریں اہلِ فن
اوزانِ رباعی میں "ترانہ" کوثر
ہیں تیس معارج میں اک صنفِ سخن

"مجھے پورا یقین ہے کہ اردو شاعری میں ترانہ ایک اہم اضافے کی صورت میں قبول کیا جائے گا اور اس نئی صنف پر مشتمل کوثر صدیقی کے مجموعے "سیپیاں" کو ہر ادبی حلقے میں عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جائے گا"۔۔۔۔ ڈاکٹر اسلم حنیف

لیجیے صاحب! آپ نے جناب کوثر صدیقی کی ایجاد و اختراع کی بابت ڈاکٹر اسلم حنیف صاحب کی قیمتی رائے اور خوش اُمیدی تو ملاحظہ فرمائی اب ذرا کوثر صدیقی صاحب کی جدت طرازی کے چند نمونہ جات بھی ملاحظہ فرمائیے تا کہ اردو ادب کی اس نئی صنفِ سخن "ترانہ" کی بابت رائے قائم کرنے میں آسانی رہے۔

ہے باعثِ تسکینِ دل و جاں ترا نام
روشن ہے ترے ذکر سے دل کی قندیل
کرتا ہوں تیرے نام میں اپنی ہر شام

ظلمت سے نبرد آزما ہونے کے لیے
آ نقشِ نگاریں کفِ پا سے اپنے
رکھ جا مری دہلیز پہ کچھ جلتے دیے

چلئے کہ اُجالوں کا نیا باب لکھیں
وہ شمع جلے جس سے اُجالوں کو جِلا
بجھتے ہوئے معصوم دیوں میں بھر دیں

اردو ادب کی نئی صنفِ سخن "ترانہ" ایک سو اٹھائیس صفحات مجلد اور دیدہ زیب سرورق سے مزین فقط ایک سو روپے ہندوستانی کے عوض زیب ملا، 79-A، کوری بھوپال بھارت سے دستیاب ہے۔

خواب، ہوا اور خوشبو

خواب سے حقیقت تک کی دنیا کو دریافت کرنے کا عمل جمیل الرحمن کے شعری مزاج کی کلید ہے۔۔۔۔۔ انور ندیم سید

میں کہ کشتی نہ تھی تو مجھ کو بھی جاگیر میں رکھ

ڈبویا اتنا کہ بیڑا اک کر دیا مجھ کو
یہ دشمنی تو مجھے خوب سازگار ہوئی

"آدمی کو اس کی ذہین اور حساس نسیم سید کی شاعری پوری کو اس کا مطالعہ کرتی ہیں۔ میں اُن کے گہرے مشاہدے، دل پذیر انداز بیاں اور ان کی جرأت پہ بار بار اور پھر پور داد دینے کے باوجود وہ حق ادا نہ کر سکا جو میرا فرض تھا"۔۔۔۔۔ ڈاکٹر شان الحق حقی

رشتہ ضرورت:

تم سے میرا رشتہ کیا
بس یہ بات ہے جاناں
میں تمہاری عادت ہوں
رشتہ ضرورت ہوں
کس قدر سلیقے سے
میرے گہرے کش لے کے
راکھ اپنی انگلی سے
میری جھاڑ دیتے ہو
کس طریقے سے
چھوٹے چھوٹے مرغولے
کر کے میری سانسوں کے
مجھ کو پھونک دیتے ہو
کس قدر محبت سے
مجھ کو آخری کش تک
پی کے۔۔۔۔۔ پھینک دیتے ہو

"نسیم سید کے مزاج اور تخلیقی خود پذیری نے نظم کے معاملے میں اس کی دسترس کو قابل رشک حد تک منفرد بنا دیا ہے۔ میرا جو لکھنا چاہتا ہے نسیم سید کی نظموں کی طرح میں بھی نظمیں لکھ سکوں مگر یہ سب ایسا آسان کب ہے۔ میری نارسائی اور نسیم سید کی دسترس نے ہی اُسے نظم لکھنے والوں میں ایک نمایاں مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں وہ گزرتے وقت کے ساتھ حسین سے حسین تر نظر آتی ہے"۔۔۔۔۔ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

قطعہ:

لہجے میں وفاؤں کی شائستگی مجبوری ہو جائے گی
دکھی دکھی سی رشتوں کی کستوری ہو جائے گی
آتے جاتے رہا کرو شدت سے کھو جائیں گے
ملتے جلتے رہا کرو ورنہ دوری ہو جائے گی

"نسیم سید جدید دنیا میں سانس لینے کے باوجود اپنی مٹی کی مہک اور اس کی فضاؤں کے لمس کے لیے بے تاب رہتی ہیں۔ کینیڈا "سنجل" کا ملک ہے جس کی بہار خزاں میں بھی دیدنی ہوتی ہے لیکن نسیم سید کو اپنے وطن کا "نیم" بہت یاد آتا ہے۔ نسیم سید دو دنیاؤں کی شہری ہیں۔ یہ دنیا کیں آپس میں کہیں کہیں ملتی جلتی ہیں اور اگر ملتی ہیں تو ایسی شاعری میں جیسی نسیم سید نے کی ہے"۔۔۔۔۔ پروفیسر سحر انصاری

دستیابی: اکادمی بازیافت، کمرہ نمبر 17، گلی نمبر 3، کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی۔ قیمت پاکستانی تین سو روپے بیرون ملک پچیس ڈالر۔

بام اندیشہ:

"امین راحت چغتائی کی غزل کے دو دھارے ہیں۔ ایک حیاتی اور دوسرا کائناتی۔ پہلے دھارے کا مشاہدہ "بہ یک نمود" میں ہو چکا۔ "بام اندیشہ" محو غور و فکر ہے۔ اس کی غزل غم کائنات سے مملو ہے جو آنکھیں کھول کر گرد و پیش کو دیکھنے پر اکساتی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ امین راحت چغتائی کا رنگ جدا گانہ اقدار سے ہے۔ سادگی، پرکاری، ایمائیت، اعتدال اور ربط، سچائی، اُس کی غزل کی چند خصوصیات ہیں۔ وطن و لہو کے اعتبار سے "یادوں بارش ہنگامہ خیز" کا متقاضی ہے۔ اس کی شاعری فعال اور رجائی ہے۔ وہ حالیات کا بھی ایک معروضی نقطہ نظر رکھتا ہے۔ غم کائنات دراصل شعور زندگی کا دوسرا نام ہے اور چغتائی کی غزل اس لحاظ سے صحت ماضی، حال کے اضطراب اور مستقبل کے امکانات کی امین ہے۔ شاعر زندگی کو ایک متحرک حقیقت سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں حسن و عشق کا تذکرہ بھی ایک وسیع اخلاقی قوت کے طور پر آیا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے شعری بصیرت بھی کہہ سکتے ہیں"۔۔۔۔۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو ادب میں ناقدین جس قدر کفایت لفظی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اس کے پس منظر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے مندرجہ بالا تاثرات قلم جناب امین راحت چغتائی کی شخصیت اور فن کو چار چاند تو لگا سکتے ہیں مگر اردو ادب کے طالب علم کے لیے کسی نئی جہت یا زاویے کو اجاگر نہیں کرتے کیونکہ جناب امین راحت چغتائی اردو ادب میں اُس مقام کے حامل اور حقدار ہیں جو نصیبوں والوں کو ملا کرتا ہے جس کا اظہار کس قدر خوبصورتی سے جناب امین راحت چغتائی خود فرما رہے ہیں۔

راحت اپنی بات ہی کچھ اور تھی
گو ہمارے بعد بھی آئے بہت

مختصر مگر جامع الفاظ میں جناب راحت امین چغتائی کی تازہ ترین کاوش "بام اندیشہ" سے آپ کا تعارف اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے عصر کے پختہ کار اور نادر احساسات و خیالات کے حامل شاعر سے روبرو ہو جائیے۔ "بام اندیشہ" تین سو اٹھتیس صفحات روشن طباعت اور دیدہ زیب مجلد سرورق کے ساتھ فقط چار سو روپے میں گلریز پبلی کیشنز، ۲۵۸، اسٹریٹ ۱۰، علامہ اقبال ٹاؤن گلریز فیز ۵، راولپنڈی سے دستیاب ہے۔

رسل و رابطے

جناب گلزار جاوید صاحب! تسلیمات

چہارسو کا ستمبر اکتوبر کا شمارہ مل گیا تھا، جس میں آپ نے میرے بارے میں خصوصی گوشہ شائع کیا ہے۔ آپ نے جس طریقے سے میری عزت افزائی کی ہے اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ راولپنڈی میری جنم بھومی ہے اس لئے اس شہر سے چھپنے والے مجلّے کا میرے بارے میں لکھنا مجھے بہت اچھا لگا۔ یوں بھی چہارسو اپنے بلند معیار کے سبب اردو مجلّوں میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ خاص شمارے کی تیاری کے سلسلے میں ہمارے درمیان جو ای میل کا سلسلہ قائم ہوا اس سے مجھے آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ میں آپ کو افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اب پتا چلا کہ آپ بلند پایہ مدیر بھی ہیں۔

منیر الدین احمد (جرمنی)

جناب گلزار جاوید! تسلیمات۔

پہلی بار آپ کا موقر جریدہ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا سو اشتیاق سے پڑھا۔ اس شمارے کی سب سے اچھی بات تو جناب منیر الدین احمد کا گوشہ ہے۔ منیر صاحب بڑے انوکھی رفتار کے ادیب ہیں۔ شہرت یافتہ سکالر ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اکادمی ادبیات نے ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس برپا کی تھی میں بھی اس میں شریک تھا۔ تبھی میری ملاقات منیر سے ہوئی تھی۔ میرے واقف کار اور دوست بہت کم تعداد میں ہیں اور پہلی ملاقات میں تو دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہاں قسمت بازی لے گئی۔ کانفرنس کے دوران ہی یعنی دو تین دنوں ہی میں میری اور منیر کی گاڑھی چھننے لگی۔ یہ خط و کتابت بھی خاصی رہی۔ اب تقریباً دو تین سال سے اس میں تعطل ہے لیکن اُن کی ادبی سرگرمیوں کی اطلاع مسلسل ملتی رہتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اُن کی خود نوشت کے چند حصے سویرا میں پڑھنے کو ملے تھے۔ اُن کی اب تک کی ادبی کاوش کافی کثیر جہتی ہے۔ میں نے اُن کے فن کے بارے میں کسی قدر جو اظہار کیا تھا وہ آپ نے اس خاص شمارے میں شامل کر دیا ہے اس کے لیے مزید کیا کہوں۔ بہر حال وہ بطور قلمکار مجھے پسند ہیں اور اُن کا شخصی حوالہ بھی خاصہ محبت بھرا ہے۔ آپ نے اُن کا جو انٹرویو کیا ہے وہ خاصہ غیر روایتی اور منفرد ہے۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ ایک مقام پر انہوں نے مجھے بھی quote کیا ہے۔ یہ ان کی کرپا ہے۔ چہارسو مجھے جنگلی پھولوں کا ایسا گلدستہ لگا کہ جس کی اپنی خوشبو اور اپنی مہک ہے۔

محمود احمد قاضی (گوجرانوالہ)

برادر محترم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون

تازہ شمارہ حسب سابق عمدہ اور خیال انگیز مندرجات سے مزین ہے۔ آپ نے منیر الدین احمد صاحب کے لیے قرطاسِ اعزاز مختص کر کے اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ منیر الدین احمد نے ترجمے اور تخلیقی ادب میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں جس کا اعتراف خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ گذشتہ شمارے میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی شخصیت اور فن کا احاطہ بھی بھرپور انداز میں کیا گیا تھا غرض اب تک آپ نے جتنے بھی خاص شمارے شائع کیے ہیں وہ سب اس قابل ہیں کہ انھیں محفوظ کیا جائے۔ مستقبل کے محققین کے لیے ان میں مستند اور مفید مواد موجود ہے۔ خاص کر آپ کے انٹرویو خاصے کی چیز ہوتے ہیں۔ جناب منیر الدین احمد کا انٹرویو ان کی شخصیت، فن، دلچسپیوں اور مشاغل کا تفصیلی تعارف کروا دیتا ہے بلکہ عالمی اور اردو ادب سے متعلق ان کے فاضلانہ خیالات سے بھی کما حقہٗ آگاہی ہوتی ہے۔ منیر الدین احمد کا مضمون "فورسم" تو کمال کا ہے۔

ناصر عباس نیّر (لاہور)

گلزار بھائی! سلام و رحمت

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ ملا اس سے پہلے کہ آپ کا شکریہ ادا کروں یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ میری غزل کا مقطع درست یوں ہے

ذرا ملنا تو پھر تم پر کھلے گا بڑے گُن ہیں ابھی ضیا میں

مرادِ والد مرحوم اقضیا جالندھری ادبی پرچہ کوئی بھی ہو اس کی ترتیب و تہذیب مدیر کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ''چہارسو'' ماہنامہ ''نگار'' سے لیکر آج کے تازہ ترین رسالوں تک ہر اعتبار سے الگ نظر آتا ہے حالانکہ نظمیں، غزلیں، مضامین اور افسانوں کے ساتھ قارئین کے خطوط پر مشتمل یہ ایک ادبی دستاویز ہے مگر بات وہی ہے اس کے مدیر کی صلاحیتوں اور ان سطر سطر کی جس میں مدیر کا ذوقِ حسن نمایاں ہے۔ موجودہ ''چہارسو'' کے مندرجات پسندیدہ ہیں۔ مجھے ان شعراء حضرات پر حیرت ہوتی ہے کہ جو ایک دوسرے کے ایک آدھ شعر کی تعریف کر کے مدیر کی صلاحیتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ آپ بھی اس قسم کے خطوط کی ان سطور کو قلم زد کر دیا کریں۔ کیونکہ کسی بھی شاعر کی تعریف یا تنقید رسالہ مرتب کرنے والے کے کھاتے میں جاتی ہے میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ گذشتہ پچاس برس سے کہ یہی ''فلاں اور رعائتی'' تنقید کا انداز دیکھتا آ رہا ہوں جو کہ مدیر کی سرپرستانہ تنقید کے مترادف ہے۔

سید ضیا شبنمی (ملتان)

میرے گلزار! خوش رہو!

چہارسو کا شمارہ جو میرے دوست ڈاکٹر خلیق انجم سے منسوب ہے میرے کینیڈا سے امریکہ پہنچنے کے بعد پہنچا ہے تو میں خلیق انجم صاحب کو پہلے سے بخوبی جانتا اور پہچانتا ہوں مگر ان کا مضمون (خاکہ) ''استاد رسا دہلوی'' پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ اپنی طوالت کے باوجود آخری سطر تک دلچسپ اور من موہ لینے والی دلّی کی یادگار باتیں پڑھ کر لطف آ گیا۔ خاص طور سے اُن کا شکر و استاد کے پاس جانا "انھیں ملنا اور استاد کا یہ کہنا" میرے بھتیجے نے قسم کھا کر کہا ہے کہ اس نے میری تعریف کی ہے ورنہ میرے شعر کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا''۔ اور استاد کا یہ شعر

میں نے جو چھیڑیں ہیں وہ زلفیں آپ کی
آپ کے سر کی قسم، دستِ صبا تھی میں نہ تھا

ماننا پڑتا ہے کہ پہلے وقتوں کے لوگ کتنے معصوم طبع، سچے، صاف گو اور سادہ ہوا کرتے تھے۔ اب تو ایسے لوگ عنقا ہو گئے ہیں۔ اس خاص شمارے کے تمام مضامین اور ڈاکٹر صاحب سے آپ کا کیا ہوا انٹرویو پڑھ کر لطف اندوز بھی ہوتا رہا اور بار بار یہی سوچتا رہا کہ آپ نے ڈاکٹر خلیق انجم جیسے مشکل آدمی کو کس طرح منایا اور پٹایا ہوگا۔ وہ آسانی سے قابو آنے والوں میں نہیں ہیں۔ مگر یہ بعد ضروری عمل تھا وہ آپ اپنے آپ میں انجمن ہیں۔ اس کارِ نیک کے لیے میری جانب سے ڈھیروں مبارک باد۔

یوگیندر بہل تشنہ (امریکہ)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، مزاج بخیر

یوں تو ڈاکٹر منیر الدین احمد سے منسوب شمارہ اپنے اندر بے پناہ علمی ادبی خزانے لیے ہوئے ہے جسے پڑھ کر لطف بھی لے رہا ہوں اور بہت سی نئی باتوں سے باخبر ہو رہا ہوں مگر شمارہ جولائی اگست کا ذکر بھی لازمی ہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد بھارت میں جن احباب نے اردو کو زندہ رکھا اور اس کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ان میں سرِ فہرست ڈاکٹر خلیق انجم کا نام آتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے نام قرطاسِ اعزاز منسوب کر کے آپ نے "حق دار رسید" کے مصداق بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے یہ ان کا حق بنتا تھا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کہنا یہی پڑتا ہے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ اللہ ان کو عمر طویل عطا فرمائے اور وہ اسی طرح اردو زبان و ادب کی بےلوث خدمت سر انجام دیتے رہیں۔

سرور انبالوی (راولپنڈی)

برادر گلزار صاحب، السلام علیکم

چہار سو ادبی معلومات کا شاہکار ہے اس میں آپ کی محنت کو بڑا دخل حاصل ہے اتنا دلکش اور دیدہ زیب ادبی پرچہ اشتہارات کا محتاج نہیں ہونا چاہیے لیکن چہار سو اشتہارات سے خالی ہے اتنے بڑے بڑے لوگ چہار سو کے قارئین اور لکھاریوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ ان کی توجہ اس جانب کیوں نہیں جاتی کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ بغیر مالی تعاون کے ادبی پرچہ نکالنا کس قدر دشوار ہے۔ نہ معلوم آپ کس کینڈے کے آدمی ہیں جو ادب اور ادیب کی محبت میں اتنا بوجھ اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ آپ کی یہ محنت ہرگز رائیگاں نہ جائے گی۔ آنے والے وقتوں میں چہار سو اپنے وقت کے نمائندہ شعر و ادب اور شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا کہلائے گا۔

اُفق دہلوی (دہلی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم

"چہار سو" کا تازہ شمارہ ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۹ء نظر نواز ہوا۔ اس بار قرطاسِ اعزاز معروف افسانہ نگار اور دانشور منیر الدین احمد کے نام ہے۔ جناب سرور انبالوی نے ڈاکٹر منیر الدین احمد کے حوالے سے خوب نظم کہی ہے۔

"میرا وراست" میں آپ کے جرأت مندانہ سوالات اور منیر الدین احمد کے تفصیلی اور غیر جانب داری سے بولڈ جوابات پڑھ کر مزا آ گیا۔ ادب کی ایک باغی صنف "افورزم" کے متعلق پہلی بار پڑھا۔ اس صنف (اگر اسے صنف کہا جائے تو) کو مستعمل اصطلاح میں ضرب المثل، قولِ زریں یا مقولہ کہا جاتا ہے یہی سنا اور پڑھا ہے۔ بہر حال ایک ایک جملے میں سچے کی باتیں ملتی ہیں۔ معنی سے پُر ایک ایک جملے میں زندگی کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ جرمن نظموں کے تراجم منیر الدین احمد نے خوب کیے ہیں۔ خصوصاً شورہ، مشغلہ اور پرواز وغیرہ نظمیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام قطعات متاثر کن ہیں۔ قطعات کا نام آتے ہی محسن بھوپالی صاحب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ پروفیسر سمیع اللہ قریشی صاحب کی تحریر "مولوی یحییٰ فضلی عرف ڈاکٹر منیر الدین احمد" یادنگاری کی عمدہ مثال ہے بہت سلیقے سے اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ "انسانی نفسیات کی تفہیم" میں پروفیسر فتح محمد ملک نے منیر الدین احمد صاحب کے افسانوں کا مجموعی تاثر پیش کیا ہے اور انہیں انسانی نفسیات اور انسانی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے ان کے ایک پرانے افسانے "سو شکستیں ایک فتح" سے لے کر "سمندر کی موت" تک کو نفسیات اور تاریخ کی تفہیم کے افسانے قرار دیا ہے۔ انتظار حسین صاحب کی تحریر "ایک باغی کی داستان" غیر متاثر کن ہے تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محترم انتظار حسین کو ان کی خود نوشت "۲ جلتے سائے" پسند نہیں آئی۔ انتظار حسین صاحب نے منیر الدین احمد پر کتاب کے حوالے سے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ "ہمیں ان کی ذہنی ترجیحات کو جاننے میں کچھ ایسی دلچسپی نہیں ہوتی یہ چیز عام طور پر محققوں اور نقادوں پر چھوڑ دی جاتی ہے"

یہ اعتراض بیجا ہے خود نوشت میں پڑھنے والے خود نوشت نگار کی زندگی کے پوشیدہ گوشوں اور رازوں کو جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ پھر محققین اور نقادانِ ادب کو لوازمہ کہاں سے ملے گا۔ "مالک رام مرحوم کا مذہب" منیر الدین احمد صاحب کا مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے مضمون سے مالک رام کی مذہب کی تبدیلی کے حوالے سے شکوک تو دور ہو جاتے ہیں مگر اس سے دو باتیں سامنے آتی ہیں کہ مالک رام کی شخصیت میں حوصلے اور استقامت کی کمی تھی۔ اس لیے اعلان نہیں کیا۔ قادیانی مسلک اختیار کرنے کی وجہ ذاتی مفاد بھی ہو سکتا ہے یعنی مصلحت پسندی ظاہر ہے قادیانی پاکستان میں غیر مسلم ہیں اب اس بحث کا کچھ حاصل نہیں۔

نسیم احمد بشیر کا ڈرامہ "قصہ کہانی کا" متاثر کن ہے مگر اختتام تک ڈراما نہیں آیا کچھ ادھورا ادھورا سا محسوس ہوا۔ "تجدید ہنر" میں شامل غزلوں میں سہیل غازی پوری، بہرام طارق، سخی سرمدی، اطہر عزیز، ماہر عظیم آبادی اور حنیف ساجد اور عرش صہبائی اور کرامت بخاری کی چھوٹی بحر کی غزلوں نے خوب مزا دیا۔ "نظمیں کہیں پاس" میں شبنم رومانی، شہریار، محمود شام اور مامون ایمن